ملک صفدر حیات (سیریز نمبر 08)
اجنبی محسن
(تحریر حسام بٹ)
عقیل قریشی
یاسر حسین
محمد
سسپنس ڈائجسٹ : اپریل 2018
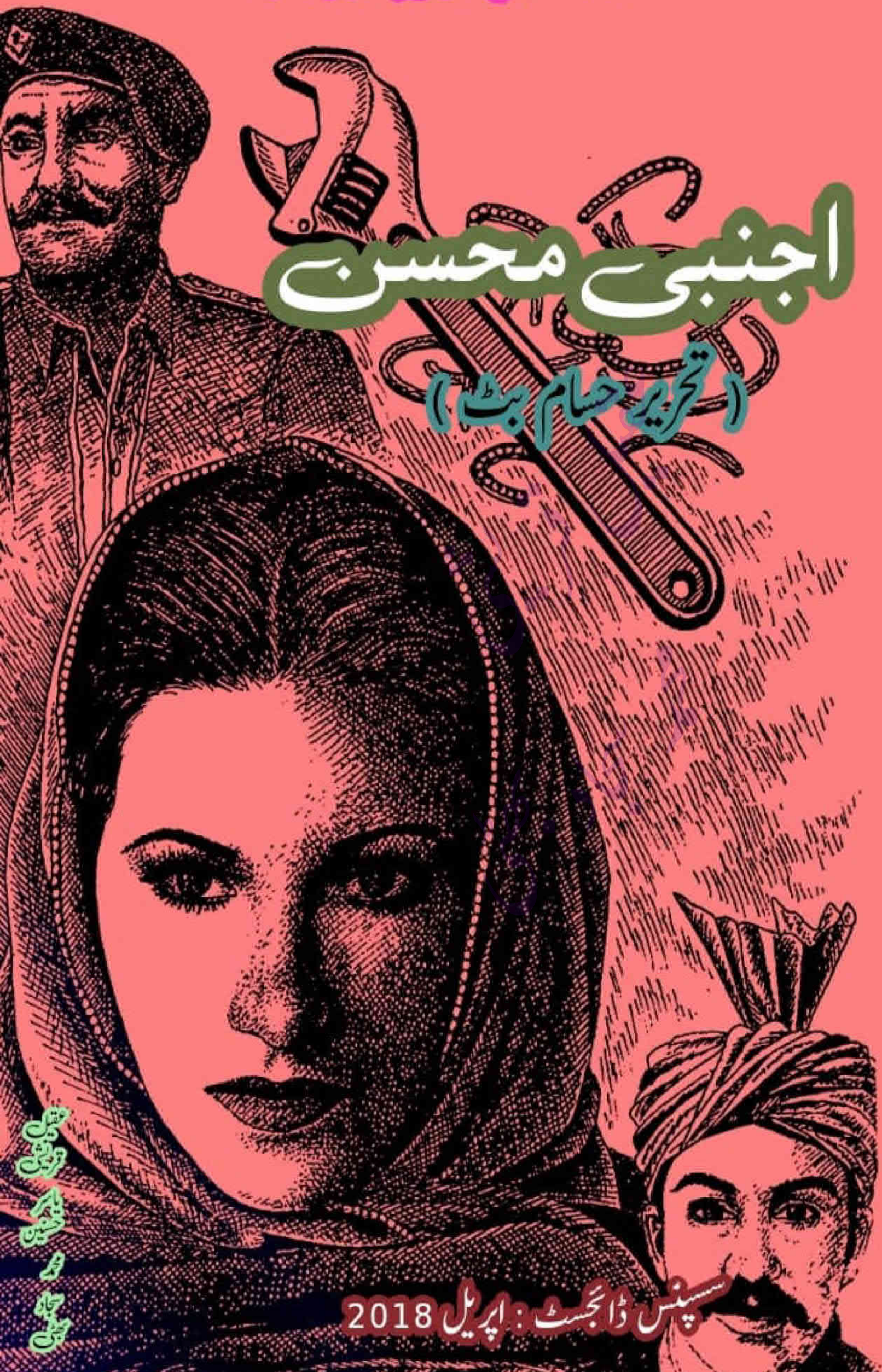
اجنبی محسن

ملک صفدر حیات

اکثر خیال آتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ دلوں میں پسندیدگی کا جذبہ نہ ڈالتا تو شاید کسی کی زندگی میں کبھی اچانک انقلاب نہ آتا... مرتے ہوئے لوگ اچانک جی نہ اٹھتے۔ وہ بھی ایک ایسے ہی لمحے کی گھٹن میں مبتلا تھی کہ کسی کی ایک نظر نے کمال کردیا... برسوں کی اجنبیت پل کے پل میں جب چاہت میں ڈھلی تو محبوب کی رفاقت کے حصول کے لیے اس اجنبی محسن نے سر دھڑ کی بازی لگادی... یہ اور بات کہ اس بازی میں اس نے کیا کھویا اور کیا پایا لیکن ایک نظر کی محبت پر اس نے اپنے نام کی مہر ثبت کردی... گائوں کے عیاش وڈیروں کے نرغے میں پھنسی ایک معصوم فطرت دوشیزہ کی بے بسی نے جب اثر دکھایا تو نہ چاہنے کے باوجود اس دلدل سے نکلنے کے لیے ان بے گناہوں سے وہ جرم سرزد ہوگیا جو وہ کرنا نہیں چاہتے تھے مگر اس کے سوا رستہ بھی تو کوئی نہ تھا۔

ملک صاحب کی ڈائری سے ظلم و ستم اور عدل و انصاف پر مشتمل

ایک اور داستان

وہ موسم سرما کی ایک ٹھنڈی ٹھار رات تھی۔ پورا چاند آب و تاب کے ساتھ آسمان پر چمک رہا تھا اور بادلوں کے ساتھ اس کی آنکھ مچولی بھی جاری تھی۔ جب بادل کا کوئی ٹکڑا چاند کے مکھڑے کو ڈھانپ لیتا تو فضا اس کی روشنی سے محروم ہوجاتی لیکن جلد ہی وہ پہلے سے بھی زیادہ شان و شوکت کے ساتھ دوبارہ نمودار ہوکر ماحول میں اجالا بھر دیتا اور قرب وجوار کی ہر شے کو منور کردیتا۔ اسی رگوں میں لہو کو منجمد کردینے والی یخ بستہ رات میں، میں حوالدار نبی بخش کے ساتھ نہر اپر چناب کے کنارے پر موجود تھا۔

ان دنوں میں ضلع گوجرانوالہ کے تھانہ صدر میں تعینات تھا۔ میرا تھانہ جی ٹی روڈ پر شیخوپورہ موڑ کے نزدیک واقع تھا۔ مجھے میرے مخبر نے اطلاع دی تھی کہ آج نصف شب شوکا ڈنگر چور مویشیوں کی کثیر تعداد کے ساتھ میرے علاقے میں داخل ہونے والا ہے۔ میں نے مویشی چور شوکت عرف شوکا کا نام سن رکھا تھا تاہم ابھی تک میرا اس سے سامنا نہیں ہوا تھا۔ اغلب امکان یہی تھا کہ آج کی رات مجھے شوکا سے دو دو ہاتھ کرنے کا موقع ملنے والا ہے۔ ان دنوں ضلع گوجرانوالہ میں مویشیوں کی منڈی لگی ہوئی تھی اور شوکا چوری کے جانوروں کو رات کی تاریکی میں مذکورہ منڈی تک پہنچانا چاہتا تھا۔ مجھے اس کی کوشش کو ناکام بنانا تھا۔ اسی مقصد کے حصول کی خاطر میں اور حوالدار نبی بخش وجود کو اکڑا دینے والی سردی کو برداشت کررہے تھے۔

نہر اپر چناب، دریائے چناب سے نکلنے والی ایک بڑی نہر ہے اور یہ گوجرانوالہ کے مضافات میں زرعی اراضی کے اندر سے گزرتی ہے۔ نہر مذکور میں پانی کا بہاؤ مشرق سے مغرب کی سمت ہے۔ ہم نے اسی نہر کے کنارے جھاڑیوں کے جھنڈ میں پناہ لے رکھی تھی اور ہماری نظریں نہر کے اس حصے پر جمی ہوئی تھیں جہاں سے شوکا نے چوری کے جانوروں کو نہر پار کرانا تھی۔ جیسا کہ میں نے بتایا، ان دنوں موسم سرما جوبن پر تھا۔ دسمبر کا مہینا اپنا نصف سفر طے کرچکا

تھا۔ نہر کے اندر پانی کی مقدار بہت کم تھی۔ مئی سے اگست تک اور اس کے بعد بھی کچھ عرصہ یہ نہر لبالب بھر کر چلتی دکھائی دیتی ہے اور پانی کی رفتار بھی آٹھ سے دس میل فی گھنٹا ہوتی ہے تاہم اس وقت نہر کے وسط میں پانی کا ایک چھوٹا سا نالا سست روی سے رواں دواں تھا۔ یہی سبب تھا کہ شونکا نے یہاں سے نہر عبور کرنے کا فیصلہ کیا تھا ورنہ بھری پری نہر میں ایسا سوچنا بھی حماقت ہوتی۔

''ملک صاحب! مجھے تو لگتا ہے، ریاست کی اطلاع درست نہیں۔'' حوالدار نبی بخش نے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو ایک دوسرے کے اوپر رگڑتے ہوئے اضطراری لہجے میں کہا۔

ریاست علی اس مخبر کا نام تھا جس نے مجھے شونکا کے بارے میں بتایا تھا۔ میں نے اپنی نگاہ کو نہر پر جمائے رکھا اور حوالدار سے پوچھا۔ ''تمھیں ایسا کیوں لگتا ہے؟''

''جناب! آدھی سے زیادہ رات گزر چکی۔'' وہ بیزاری سے بولا۔ ''کیا ہم صبح تک اس منحوس شونکا کے انتظار میں ادھر ہی بیٹھے سردی میں ٹھٹھرتے رہیں گے؟''

''آدھی رات کا گزر جانا یا شونکا کا منحوس ہونا یا ہمارا سردی میں ٹھٹھرنا......'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اس سے کہیں بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ریاست علی کی اطلاع درست نہیں۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں ملک صاحب۔'' وہ جزبز ہوتے ہوئے بولا۔ ''لیکن میرے خیال میں اب تک اسے یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا۔''

''میرا بھی کچھ ایسا ہی خیال ہے۔'' میں نے رسٹ واچ پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ ''رات واقعی آدھی سے آگے بڑھ چکی ہے۔ اس وقت ساڑھے بارہ بج رہے ہیں اور آج کل تو سورج بھی لگ بھگ پانچ بجے غروب ہو جاتا ہے۔ اس حساب سے تو رات ہوئے سات گھنٹے گزر چکے ہیں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ شونکا نے ہمارے نہیں، اپنے پروگرام کے مطابق آنا ہے لہٰذا ہمارے بیٹھے کا تقاضا تو یہی ہے کہ کم از کم اذانِ فجر تک شونکا کی راہ دیکھی جائے......'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''آج تک ریاست نے مجھے کبھی غلط اطلاع نہیں دی۔ وہ میرے بھروسے کا بندہ ہے۔''

''میں ریاست کی قابلیت پر شک نہیں کر رہا ملک صاحب۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''یہ بھی تو ہو سکتا ہے، شونکا نے اپنا پروگرام تبدیل کر دیا ہو......''

''ہاں، ایسا ہو سکتا ہے۔'' میں نے گول مول جواب دیا۔

نبی بخش نے واضح طور پر اپنا بیان بدلا تھا۔ پہلے اس نے بڑے مضبوط انداز میں کہا تھا کہ ریاست کی اطلاع درست نہیں لیکن جب اس نے دیکھا کہ میں ریاست پر اپنے اعتماد کا اظہار کر رہا ہوں تو اس نے بھی اپنے خیال کی پٹری بدل لی تھی۔ ہم اس وقت کھیتوں کے بیچ کھلے ماحول میں، جھاڑیوں کے جھنڈ میں بیٹھے ہوئے تھے اور موسم کی یخ بستگی نے حوالدار کی مت مار دی تھی۔ ایسا نہیں ہے کہ مجھے سردی نہیں لگ رہی تھی۔ سردی کا تو کام ہی لگنا ہے۔ یہ سب کو لگتی ہے۔ بس، اپنی اپنی برداشت کی بات ہے۔

''وہ کیا ہے......؟'' بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

''کہاں...... کدھر...... کیا......؟'' نبی بخش الرٹ لہجے میں بولا۔

میں نے نہر کی مشرقی سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ دیکھو۔ نہر کے اندر...... کچھ تیرتا ہوا ہماری طرف آ رہا ہے۔''

چاندنی رات کی وجہ سے کافی دور تک دیکھنا آسان ہو گیا تھا۔ نہر کے پانی کا بہاؤ مشرق سے مغرب کی سمت تھا اور وہ ''چیز'' ادھر مشرق کی جانب سے بہتی ہوئی ہماری طرف آ رہی تھی۔

''مجھے تو یہ کپڑوں کی کوئی گٹھڑی لگ رہی ہے۔'' نبی بخش نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

''اگر یہ کپڑوں کی گٹھڑی نہیں تو پھر کوئی انسان ہے۔'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''لباس سمیت......''

''مگر آدھی رات کو کون تیراکی کرے گا ملک صاحب؟'' اس نے بے حد الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اور وہ بھی اس قدر ٹھنڈی رات میں۔''

''نبی بخش! مجھے لگتا ہے، سردی نے تمہارے حواس کو جما دیا ہے۔'' میں نے لہر میں تیرتے ہوئے ٹارگٹ کو اپنی نگاہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''ورنہ تم ایسی احمقانہ بات کبھی نہ کرتے۔''

''میں نے کیا کیا ہے جی؟'' وہ حیرت بھرے انداز میں بولا۔

''تیراکی کرتے وقت انسان اپنے لباس میں نہیں ہوتا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''وہ اپنے کپڑوں کو بدن سے جدا کر کے تیراکی کا مخصوص جانگیا یا نیکر

پہن لیتا ہے جبکہ ہماری آنکھیں اس کے برعکس نظارہ کر رہی ہیں۔ مجھے تو یہ کوئی اور ہی چکر نظر آ رہا ہے۔''

میں نے آخری جملہ اتنے سنسنی خیز انداز میں ادا کیا تھا کہ وہ بے ساختہ پوچھ بیٹھا۔ ''کیسا چکر ملک صاحب؟''

''یہ کسی انسان کی لاش بھی تو ہو سکتی ہے۔'' میں نے انکشاف انگیز انداز میں کہا۔

''اوہ......!'' نبی بخش نے تشویش بھری سانس خارج کی۔

''تیاری پکڑلو نبی بخش۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''یہ جو کچھ بھی ہے، لگ بھگ دس منٹ میں ہمارے سامنے سے گزرے گا اور ہم نے اسے نہر سے باہر نکالنا ہے۔''

''اس کام کے لیے تو ہمیں نہر میں اترنا پڑے گا......'' وہ ہچکچاہٹ بھرے انداز میں بولا۔

''بالکل!'' میں نے قطعی لہجے میں کہا۔ ''اور اس مہم جوئی میں بڑی حد تک ہمارے لباس بھی بھیگ جائیں گے اور ہمیں سخت سردی بھی لگے گی لیکن کیا کریں...... یہ کارِ سرکار ہے۔ اس طرح تو ہوتا ہے، اس طرح کے کاموں میں۔''

بات ختم کرتے ہی میں نے اپنے بوٹ اتار دیے اور پتلون کے پائنچوں کو اڑسنے میں مصروف ہو گیا۔ اپنے سینئر کو اس کام میں مصروف دیکھ کر نبی بخش کے پاس کوئی جائے فرار نہ رہی چنانچہ وہ بھی میرا ساتھ دینے کی تیاری کرنے لگا۔

جن دنوں اپر چناب نہر اپنے کناروں تک بھر کر بہہ رہی ہوتی ہے اس وقت اس کے قلب کی گہرائی کم و بیش بیس فٹ ہوتی ہے۔ یہ میں نے اوسط گہرائی بتائی ہے ورنہ بعض مقامات پر خصوصاً کسی پل کے بعد اس کے قلب میں پانی کی گہرائی پچیس سے تیس فٹ تک بھی چلی جاتی ہے لیکن ان دنوں پانی کا زور ٹوٹا ہوا تھا۔ نہر کے وسط میں پانی کا جو نالا سا بہہ رہا تھا، میرے محتاط اندازے کے مطابق اس کی گہرائی پانچ چھ فٹ سے زیادہ نہیں تھی۔ ہم آسانی سے اپنے ٹارگٹ کو کھینچ کر پانی سے باہر لا سکتے تھے۔

ہم نے جلد ہی اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کر لی اور یہ دیکھ کر میرے تمام اندازوں کی تصدیق ہو گئی کہ گٹھڑی کی صورت دکھائی دینے والی وہ ''چیز'' ایک انسان تھا۔ ایک مرد...... جو میرے فوری خیال کے تحت دارِ فانی سے کوچ کر گیا تھا۔ میں نے نبی بخش کی مدد سے اس شخص کی لاش کو کھینچ کر اپنی کمین گاہ والی جھاڑیوں کے نزدیک ڈال دیا۔

''ملک صاحب! یہ بدنصیب کون ہو سکتا ہے؟'' نبی بخش نے تشویش ناک انداز میں کہا۔ ''مجھے تو لگتا ہے، یہ مر چکا ہے۔''

''مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔'' میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ ''اس کی شناخت کا معاملہ تو صبح ہونے کے بعد ہی حل کیا جا سکتا ہے۔ جب تک میں اس کا تفصیلی معائنہ نہ کرلوں، حتمی طور پر کچھ بھی نہیں کہہ سکتا اور یہ کام دن کی روشنی ہی میں کیا جا سکتا ہے۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں ملک صاحب۔'' نبی بخش نے کپکپائی ہوئی آواز میں کہا۔

نصف سے زیادہ لباس بھیگ جانے کے سبب نبی بخش کی بقول کسے قلفی جم چکی تھی۔ ان لمحات میں وہ شدید سردی کی لپیٹ میں تھا۔ حالت میری بھی کچھ زیادہ اچھی نہیں تھی تاہم میں حالات اور موسم کی سختی کو جھیلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہمیں زیادہ دیر تک اس کیفیت میں نہیں رہنا پڑا جس مقصد کے حصول کی خاطر ہم نے جھاڑیوں کے اس جھنڈ میں پڑاؤ ڈالا ہوا تھا، اس مقصد کے پورا ہونے کے آثار نمودار ہو گئے۔ چاندنی رات نے مجھے اور نبی بخش کو بڑے واضح انداز میں دکھایا کہ لگ بھگ چار درجن مویشی نہر کے ایک کنارے سے اندر اتر رہے تھے......

میرے رگ و پے میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ کچھ ایسا ہی حال نبی بخش کا بھی تھا۔ شونکا ڈنگر چور مالِ مسروقہ سمیت ہماری نگاہ میں آ گیا تھا۔ ریاست کی اطلاع حقیقت کا روپ دھار چکی تھی۔ موسم کی شدت کا احساس ہم سے کوسوں دور جا چکا تھا۔ ایسے میں سردی لگنے کا کیا سوال۔

ہم پورے جوش و خروش کے ساتھ شونکا کو چھاپنے کے لیے آگے بڑھنے لگے جو ہم سے چند قدموں کی دوری پر چوری شدہ مویشیوں کے ساتھ نہر کے اندر اتر چکا تھا۔

☆☆☆

میں نے تجربہ کار نگاہ کا استعمال کر کے اندازہ لگا لیا تھا کہ اس بدبخت کو پلک جھپکتے میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ قاتل جو کوئی بھی تھا، وہ پہلوانی، کبڈی یا کسی اور شہ زوری کے شعبے سے تعلق رکھتا تھا کیونکہ مقتول کی گردن کا منکا توڑ کر جس طرح اسے زندگی کی قید سے آزاد کیا گیا تھا اس نوعیت کا تکنیکی کام کسی عام آدمی کے بس کی بات نہیں تھی۔ یہ کسی داؤ پیچ کے ماہر کاریگر کا کارنامہ تھا جس نے مقتول کی گردن کو طوفانی جھٹکا دے کر اس جہاں سے اس جہاں میں پہنچا دیا تھا۔ مجھے اس ماہرِ فن قاتل کا سراغ لگانا تھا اور اس

سے قبل مقتول کی شناخت ضروری تھی۔

قارئین! یہ کہانی شونکا ڈنگر چور کے ذکر سے شروع ہوئی تھی۔ بعدازاں ایک نامعلوم شخص کی لاش اس کہانی کے اندر داخل ہوگئی۔ حالات کا تقاضا یہ ہے کہ فوری توجہ کے طالب معاملے کو پہلے بیان کیا جائے اور ظاہر ہے، کسی انسان کا قتل، کسی پیشہ ور چور کی گرفتاری سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے لہٰذا میں شونکا کے ذکر کو پھر کسی وقت کے لیے محفوظ رکھتے ہوئے نامعلوم مقتول کی طرف آتا ہوں۔ آگے بڑھنے سے پہلے آپ کی معلومات کے لیے اتنا بتادوں کہ اس ٹھنڈی ٹھار رات میں نے شونکا کو اس کے دو ساتھیوں الیاس اور افضل سمیت گرفتار کرلیا تھا۔ شونکا کے قبضے سے چوری شدہ بیالیس مویشی بھی میرے ہتھے چڑھے تھے جن میں تیس بھینسیں اور بارہ گائے شامل تھیں۔

مقتول کی عمر پچیس اور تیس کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ مضبوط جسم کا مالک ایک قبول صورت شخص تھا۔ اس نے بڑی رعب دار موٹی تازی مونچھیں پال رکھی تھیں۔ اس کے بدن پر گرم لباس تھا اور موسم کی مناسبت سے اس نے اونی سویٹر بھی پہن رکھا تھا۔ اس کی جامہ تلاشی سے مجھے کوئی ایسی شے نہیں ملی جس کا یہاں ذکر کیا جائے۔ میں نے اچھی طرح ٹٹول کر اس کے سارے وجود کا معائنہ بھی کرلیا تھا لیکن اس کے جسم پر کہیں بھی ایسا کوئی زخم دریافت نہیں ہوا جسے اس کی موت سے منسوب کیا جاتا جس کا ایک ہی مطلب تھا کہ گردن کا منکا توڑ کر چشم زدن میں اس بدنصیب کو سپردِ موت کردیا گیا تھا۔ اس کے بعد اس اجل رسیدہ کو نہر کی سست رفتار لہروں کے حوالے کردیا گیا تھا۔

اس نامعلوم مقتول کی لاش کی دریافت کا سہرا میرے اور حوالدار نبی بخش کے سر بندھتا تھا۔ گزشتہ شب جب ہم نے اس مردہ شخص کو نہر سے نکالا تو ہم دونوں کے سوا وہاں اور کوئی نہیں تھا لیکن اب درجن بھر افراد وہاں موجود تھے اور یہ صبح کے لگ بھگ نو بجے کا وقت تھا۔ سورج طلوع ہوچکا تھا تاہم ابھی تک اس کی دھوپ میں تمازت اور تپش شامل نہیں ہوئی تھی، پھر بھی گزشتہ شب کی بہ نسبت اس وقت موسم خاصا خوشگوار تھا۔

میں نے موقع پر موجود مختلف لوگوں کو مردہ شخص کا چہرہ دکھا کر اس کی بابت دریافت کیا۔ ان میں زیادہ تر کھیت مزدور تھے جو حسب معمول نہر کی دونوں جانب واقع کھیتوں میں کام کرنے آئے تھے لیکن وہاں پولیس کی موجودگی نے انہیں خوف و ہراس میں مبتلا کردیا تھا۔ ان میں سے ہر ایک نے فرداً فرداً اس مردہ شخص کو پہچاننے سے انکار کردیا۔ ایک عمر رسیدہ بڈھے بابے نے قدرے امید افزا بات کی۔

''تھانے دار صاحب! میں نے اس بندے کو چودھری کی حویلی میں دیکھا ہے۔'' وہ آنکھیں سکوڑ کر مردہ شخص کی طرف تکتے ہوئے بولا۔ ''لیکن یہ یاد نہیں آرہا کہ اس کا نام کیا ہے۔''

میں نے چونک کر اس بزرگ کی جانب دیکھا اور پوچھا۔ ''چاچا! تمہیں اپنا نام تو یاد ہے نا؟''

''جی سرکار'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''مجھے اللہ رکھا کہتے ہیں۔''

''چاچا اللہ رکھا! اللہ تمہاری حفاظت کرے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اس بندے کا نام یاد کرنے کی ضرورت نہیں۔ بس یہ بتادو کہ تم نے اسے کس چودھری کی حویلی میں دیکھا تھا؟''

''چودھری سکندر علی کی حویلی میں تھانے دار صاحب۔'' وہ بڑے وثوق کے ساتھ بولا۔ ''میں فرید پور کے چودھری صاحب کی بات کررہا ہوں۔''

میں چودھری سکندر کو جانتا تھا۔ دو تین مرتبہ اس سے میری ملاقات بھی ہوچکی تھی۔ کچھ عرصہ پہلے چودھری سکندر کو فالج کا اٹیک ہوا تھا جس نے اس کے جسم کا زیریں حصہ بالکل ناکارہ کردیا تھا جس کے بعد وہ بستر کا ہوکر رہ گیا تھا۔ چودھری سکندر روایتی چودھریوں سے بہت مختلف تھا۔ اس کے اندر مجھے غرور، تکبر اور حد سے متجاوز خود پسندی بالکل نظر نہیں آتی تھی۔

''اس کے علاوہ تم اس بندے کے حوالے سے کچھ جانتے ہو تو مجھے بتاؤ۔'' میں نے اللہ رکھا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔ ''کیا اس کا تعلق فرید پور ہی سے ہے؟''

''میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' وہ بے بسی سے گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ہوسکتا ہے، یہ ادھر ہی کا رہنے والا ہو یا کہیں اور سے آیا ہو......''

میں نے مزید دو چار سوالات کے بعد اللہ رکھا کو فارغ کردیا۔

آج صبح اس طرف آتے ہوئے میں اپنے ساتھ کانسٹیبل باسط اور سرکاری فوٹوگرافر آفتاب کو بھی لے آیا تھا۔ ہم تینوں گھوڑوں پر سوار ہوکر یہاں پہنچے تھے۔ اگر مقتول مکمل طور پر نامعلوم رہتا تو میں سرکاری فوٹوگرافر سے مختلف زاویوں کی تین چار تصویریں بنوانے کے بعد لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے سرکاری اسپتال بھجوا دیتا لیکن اللہ رکھا

نے مجھے ایک اور انداز میں سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ لاش کا پوسٹ مارٹم تو ہر صورت میں ہونا ہی تھا لیکن اس سے پہلے چودھری سکندر علی کو ٹچ کرنا میں ضروری سمجھتا تھا۔

میں نے کانسٹیبل باسط کو لاش کے پاس چھوڑا اور خود گھوڑے پر سوار ہو کر فرید پور کی جانب روانہ ہو گیا۔ میں نے باسط کو ہدایت کر دی تھی کہ میری واپسی تک وہ لاش کو سرکاری اسپتال پہنچانے کے انتظامات مکمل کر لے۔

جس مقام پر ہم نے نہر سے وہ لاش نکالی تھی، وہاں سے فرید پور کم و بیش آٹھ میل کے فاصلے پر مشرق کی سمت نہر کے کنارے واقع ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ ان دونوں مقامات کے بیچ میں اور کوئی آبادی نہیں تھی۔ بابا اللہ رکھا کی بات میں مجھے اس لیے بھی وزن محسوس ہوا کہ نامعلوم مقتول کا تعلق فرید پور سے ہو سکتا تھا۔ اغلب امکان اس بات کا تھا کہ کسی نے اسے قتل کر کے اس کی لاش کو حوالۂ نہر کر دیا ہوگا۔

آج اگرچہ آسمان پر سورج موجود تھا لیکن اس کی دھوپ سردی کی ماری ہوئی تھی۔ اگر مجھے واپسی میں تین چار گھنٹے بھی لگ جاتے تو لاش کے لیے کسی قسم کی تشویش والی کوئی بات نہیں تھی۔

میں نے سوچا تو تین چار گھنٹے کا تھا لیکن تین چار منٹ کے بعد ہی صورتِ حال میں سنسنی خیز تبدیلی رونما ہو گئی۔ جائے وقوعہ سے فرید پور جانے کے لیے مجھے نہر کے کنارے اور کھیتوں کے درمیان بنے ہوئے کچے راستے پر سفر کرنا تھا۔ ابھی میرے گھوڑے نے دو تین سو گز کا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ دو گھڑسوار میرے قریب پہنچ کر رک گئے۔ وہ دونوں میری مخالف سمت یعنی فرید پور کی طرف سے آ رہے تھے۔ مجبوراً مجھے بھی اپنا گھوڑا روکنا پڑا۔ ان دونوں گھڑ سواروں کے چہرے کے تاثرات نے مجھے بتا دیا کہ ان کے پاس خوشی کی کوئی خبر نہیں ہوگی۔

''کیا بات ہے۔'' میں نے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔ ''تم لوگ کہاں سے آ رہے ہو اور یہ تمہارے چہروں پر ہوائیاں کیوں اڑ رہی ہیں۔ کیا راستے میں کسی چھل پیری کو دیکھ لیا ہے؟''

''ہم لوگ آپ کے پاس تھانے جا رہے تھے۔'' ان میں سے ایک نے بدحواسی کے عالم میں بتایا۔ ''اچھا ہوا آپ راستے ہی میں مل گئے۔ اب آپ ہمارے ساتھ چلیں تو آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔''

''کہاں لے جانا چاہتے ہو مجھے؟'' میں نے تیز نظر سے انہیں گھورا۔

''فرید پور......'' دوسرے نے جواب دیا۔

فرید پور کا نام سن کر میں چونک اٹھا کیونکہ میں تو خود فرید پور ہی کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''فرید پور میں ایسا کیا ہو گیا ہے جو تم مجھے اپنے ساتھ وہاں لے جانا چاہتے ہو؟''

''چودھری صاحب کو کسی نے قتل کر دیا ہے تھانے دار صاحب۔'' ایک نے دکھی لہجے میں بتایا۔

دوسرا بولا۔ ''ہم اسی واقعے کی اطلاع دینے آپ کے پاس تھانے آ رہے تھے کہ آپ ہمیں راستے ہی میں مل گئے۔''

بعدازاں مجھے ان دونوں گھڑسواروں کے نام راشد اور منہاس معلوم ہوئے جن میں راشد پستہ قامت اور منہاس دراز قد تھا۔ ''چودھری صاحب کے قتل'' کے الفاظ نے میرے اندر کھلبلی مچا دی تھی۔ میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''تم چودھری سکندر کی بات کر رہے ہو؟''

''نہیں جناب! انہیں کوئی کیا قتل کرے گا۔'' راشد نے بتایا۔ ''وہ تو ہلنے جلنے کے بھی قابل نہیں ہیں۔''

''پھر؟'' میں نے باری باری سوالیہ نظر سے ان کی طرف دیکھا۔

''ہم چودھری رستم کی بات کر رہے ہیں تھانے دار صاحب۔'' منہاس وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ چودھری سکندر کے اکلوتے بیٹے ہیں...... میرا مطلب ہے، اکلوتے بیٹے تھے۔''

''چودھری رستم کو کس نے قتل کیا ہے؟'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں دریافت کیا۔ ''اور یہ واقعہ کب پیش آیا؟''

ہمارے درمیان یہ تمام تر گفتگو گھوڑوں پر سوار رہ کر ہو رہی تھی۔ میرے سوال کے جواب میں منہاس نے بتایا۔

''قاتل کے بارے میں تو فی الحال کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن یہ واقعہ پچھلی رات کا ہے۔ چھوٹے چودھری صاحب کی لاش ادھر ڈیرے پر پڑی ہے۔''

''اوہ......!'' میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

اسی لمحے بابا اللہ رکھا سے حاصل ہونے والی معلومات میرے ذہن میں تازہ ہو گئیں۔ فرید پور ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ بہ مشکل ستر سے اسّی گھر ہوں گے وہاں۔ لگ بھگ تین سو نفوس کی آبادی میں ہر شخص دوسرے کا صورت آشنا ہوتا ہے۔ میں نے ان سے پوچھا۔ ''اچھی طرح سوچ کر بتاؤ، کیا

اس واقعے کے بعد فرید پور سے کوئی بندہ غائب ہوا ہے؟"
"بالکل ہوا ہے تھانے دار صاحب۔" راشد جلدی سے بولا۔
منہاس نے اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔"لیکن آپ کو کیسے پتا چلا کہ قادو گاؤں سے غائب ہے؟"
"تو اس کا نام قادو ہے؟" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔
"اصل نام تو قادر ہے جناب لیکن سب اسے قادو کہہ کر ہی پکارتے ہیں۔" راشد نے بتایا۔"قادو کی ڈیوٹی ڈیرے پر ہوتی ہے لیکن وہ صبح ہی سے غائب ہے یا...... شاید رات سے۔"
"وہ ڈیوٹی پر اس لیے حاضر نہیں کہ اب وہ ڈیوٹی کرنے کے قابل نہیں رہا۔" میں نے معنی خیز مگر سنجیدہ لہجے میں کہا۔
"ڈیوٹی کرنے کے قابل نہیں رہا......؟" راشد بھونچکا نظر سے مجھے تکنے لگا۔
منہاس نے کہا۔"آپ کی بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی تھانے دار صاحب۔ ہمیں تو شک تھا کہ قادو چھوٹے چودھری صاحب کے قتل میں ملوث ہے اس لیے وہ ڈیرے سے کہیں فرار ہو گیا ہے۔"
"ہو سکتا ہے، قادو ہی نے چودھری رستم کو قتل کیا ہو۔" میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔"لیکن پچھلی رات وہ خود بھی مقتول ہو چکا ہے، اگر میرا اندازہ غلط نہیں ہے تو...... اور میرے اس اندازے کی تصدیق یا تردید تم دونوں کرو گے۔"
بات کے اختتام پر میں نے باری باری راشد اور منہاس کی آنکھوں میں جھانکا تو راشد نے بے حد الجھے ہوئے انداز میں مجھ سے استفسار کیا۔
"ہم یہ کام کس طرح کر سکتے ہیں تھانے دار صاحب؟"
"اس طرح......" میں نے اپنے گھوڑے کو واپسی کے لیے موڑتے ہوئے کہا۔"آؤ میرے ساتھ۔ پہلے میں تمہیں قادو سے ملوا دوں۔ اس کے بعد ہم فرید پور کا رخ کریں گے۔"
وہ دونوں ہکا بکا ہو کر میری تقلید میں اپنے گھوڑے دوڑانے لگے۔
چند منٹ کے بعد ہم جائے وقوعہ پر پہنچ گئے یعنی اس مقام پر جہاں جھاڑیوں کے جھنڈ کے نزدیک نامعلوم شخص کی گردن ٹوٹی لاش رکھی ہوئی تھی۔ راشد اور منہاس کے وہاں پہنچتے ہی وہ مردہ شخص نامعلوم نہیں رہا تھا۔ ان دونوں نے میرے اندازے کی تصدیق کر دی تھی یعنی وہ چودھری کے نمک خوار قادر عرف قادو ہی کی لاش تھی۔
"اس کو کیا ہوا ہے تھانے دار صاحب......" راشد نے سہمی ہوئی نظر سے میری جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "اسے کس نے قتل کیا ہے؟"
"تم لوگوں کا خیال تھا کہ چھوٹے چودھری کے قتل میں قادو کا ہاتھ ہو گا۔" میں نے کہا۔"لیکن یہ بے چارہ تو خود بھی قتل ہو چکا ہے۔ قادو کی گردن توڑ کر اسے سپرد موت کر دیا گیا ہے اور یہ واقعہ فرید پور کے قریب ہی کہیں پیش آیا ہے۔ اس کی لاش نہر کے پانی میں بہتی ہوئی گزشتہ رات ساڑھے بارہ بجے یہاں پہنچی تھی۔ اس مقام سے فرید پور کا فاصلہ لگ بھگ آٹھ میل ہے اور آج کل اپر چناب کم و بیش چار پانچ میل فی گھنٹا کی رفتار سے بہہ رہی ہے جو ایک شخص کے پیدل چلنے کی عمومی رفتار ہے۔ اس حساب سے میرے محتاط اندازے کے مطابق قادو کو پچھلی رات ساڑھے دس بجے کے قریب فنا کے گھاٹ اتارا گیا ہے۔"
وہ بے حد الجھن زدہ انداز میں کبھی مجھے اور کبھی قادو کی لاش کو تکنے لگے۔ میں نے پہلی فرصت میں تھانے سے اے ایس آئی یعقوب کو وہاں بلا لیا۔ دوسری فرصت میں، میں نے قادو کی لاش کو ایک ریڑھے پر لدوا کر یعقوب کی نگرانی میں ضلعی اسپتال بھجوا دیا اور تیسری فرصت میں، میں کانسٹیبل باسط کو ساتھ لے کر راشد اور منہاس کے ہمراہ فرید پور کی جانب روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

فرید پور کا شمار چھوٹے گاؤں میں ہوتا تھا۔ نہر کے کنارے پر واقع اس گاؤں کی آبادی تین سے چار سو افراد کے درمیان رہی ہو گی۔ فرید پور نامی اس مختصر سے گاؤں پر چودھری سکندر علی کا راج تھا جو پچھلے کچھ عرصے سے فالج کا شکار ہو کر بے بسی اور محتاجی کی زندگی گزار رہا تھا اور اسی لاچار چودھری کے اکلوتے بیٹے رستم علی کو گزشتہ رات کسی نے قتل کر دیا تھا۔
ہم دوپہر کے بعد فرید پور پہنچے تھے۔ میں نے راشد سے کہا۔"تم لوگوں نے بتایا ہے کہ چھوٹے چودھری کی لاش ڈیرے پر پڑی ہے؟"
"جی تھانے دار صاحب۔" اس نے اثبات میں جواب دیا۔"بڑے چودھری صاحب نے ہمیں حکم دیا تھا کہ جب تک پولیس اپنی کارروائی مکمل نہ کر لے، کوئی شخص

ڈیرے کے اندر نہ جائے اسی لیے ہم نے ڈیرے کے بیرونی دروازے پر تالا ڈال دیا ہے۔''

''یہ تم لوگوں نے عقل مندی کا کام کیا ہے۔'' میں نے ستائشی نظر سے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''تو چلیں، پہلے ڈیرے والی کارروائی مکمل کرلیتے ہیں۔ اس کے بعد چودھری سکندر سے بھی ملاقات ہوجائے گی۔''

وہ دونوں میرے ساتھ چل پڑے۔

مذکورہ ڈیرا نہر کے کنارے کھیتوں کے بیچ بنا ہوا تھا۔ ڈیرے کے اندر اور باہر دیواروں کے ساتھ قد آور درخت بھی لگے ہوئے تھے۔ یہ ڈیرا نیچی چھتوں والے تین کمروں پر مشتمل تھا جو ایک ہی قطار میں احاطے کے عقبی حصے میں بنے ہوئے تھے۔ اس کے آگے ڈیرے کا کشادہ صحن تھا۔ کراچی کے باسی اس صحن کی کشادگی کو سمجھنے کے لیے اس کو ہزار گز کا کوئی پلاٹ تصور کرلیں۔ ہم نے اپنے گھوڑوں کو گھنے درختوں کے نیچے باندھ دیا اور ڈیرے کے اندر داخل ہوگئے۔ ڈیرے کی بیرونی دیوار کے ساتھ پیپل اور سفیدے کے قد آور درخت ایستادہ تھے۔ جس دوران میں ہم اپنے گھوڑوں کو ''پارک'' کررہے تھے، منہاس نے آگے بڑھ کر ڈیرے کا گیٹ نما چوبی دروازہ کھول دیا تھا۔ مجھے وہاں پر ڈیرے کے آس پاس کچھ لوگ بھی کھڑے دکھائی دیے جو یقیناً چھوٹے چودھری کی موت پر دکھی اور پریشان تھے۔

ڈیرے کے صحن میں ایک دیوار کے ساتھ چند مویشی بھی بندھے ہوئے تھے جو موجودہ حالات سے بے نیاز اپنی کھرلیوں میں چارے پر منہ مارنے میں معروف تھے۔ انہیں اس بات کی مطلق فکر نہیں تھی کہ ان کے مالک کا اکلوتا بیٹا دارِفانی سے کوچ کرگیا تھا۔

''چھوٹے چودھری کی لاش کس کمرے میں ہے؟'' میں نے راشد سے سوال کیا۔

اس نے درمیان والے کمرے کی جانب اشارہ کردیا۔

میں کانسٹیبل باسط کے ساتھ مذکورہ کمرے کے اندر داخل ہوگیا اور یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ وہ کمرا کسی عالیشان بیڈروم کا منظر پیش کرتا تھا جس کی ایک دیوار کے ساتھ آرام دہ پلنگ بچھا ہوا تھا اور چودھری رستم کی لاش اسی پلنگ پر پڑی تھی۔

میں نے رستم کی لاش کا بغور جائزہ لیا تو اس کے سر کی چوٹ فوراً ہی میری نگاہ میں آگئی۔ چودھری کی کھوپڑی کا عقبی حصہ بری طرح چٹخا ہوا تھا اور وہاں سے نکلنے والے خون نے چودھری کے لباس کو بھی جگہ جگہ سے آلودہ کررکھا تھا حتیٰ کہ بستر کے بعض حصے بھی خون کے دھبوں سے بھرے ہوئے تھے۔ مجھے یہ سمجھنے میں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا کہ قاتل نے کسی آہنی شے کی مدد سے چودھری رستم کے عقب سے وار کرکے اسے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ یہ چوٹ اتنی کاری ثابت ہوئی کہ چودھری کی کھوپڑی کا حشر نشر ہوگیا تھا اور اسے زندگی سے موت کی طرف جانے میں چند سیکنڈ ہی لگے ہوں گے۔ قاتل کے حملے میں بہت زیادہ غم وغصے کی نشان دہی ہوتی تھی۔

لاش کے تفصیلی معائنے سے فارغ ہونے کے بعد میں نے اس سجے سجائے بیڈروم کا تنقیدی جائزہ لیا تو ایک میز پر مجھے بچی شراب کی بوتل رکھی دکھائی دی۔ ساتھ ہی ایک گلاس بھی پڑا ہوا تھا جو ایک چوتھائی شراب سے بھرا ہوا تھا۔ بوتل بھی کھلی ہوئی تھی جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ اپنی موت سے قبل وہ دخترِ انگور سے دل بہلا رہا تھا اور بے خبری میں کسی سفاک شخص نے اسے زندگی کی قید سے آزاد کردیا تھا۔

دخترِ انگور، دخترِ انسان کا تقاضا کرتی ہے۔ چھوٹا چودھری اس ڈیرے پر عبادت گزاری کی نیت سے نہیں آیا تھا۔ کمرے کی سجاوٹ اور جام ومینا سے پتا چلتا تھا کہ ڈیرے کا یہ کمرا چودھری رستم کا عشرت کدہ ہے جہاں پر وہ عیش وعیاشی کے لمحات گزارنے آیا کرتا تھا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد میں نے مذکورہ کمرے میں دخترِ انسان کے آثار بھی دریافت کرلیے۔

بیڈ کے نزدیک کمرے کے فرش پر مجھے چوڑیوں کے چند ٹکڑے پڑے دکھائی دیے۔ میں نے جھک کر بڑی احتیاط کے ساتھ کچے فرش پر سے سرخ اور سبز چوڑیوں کے ٹکڑے اٹھالیے۔ چوڑیاں خواتین کا ایک زیور ہے۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ پچھلی رات اس کمرے میں چھوٹے چودھری کے ساتھ کوئی عورت بھی موجود تھی اور چوڑیوں کے ٹکڑے یہ کہانی سنا رہے تھے کہ چودھری نے اس عورت کے ساتھ زور زبردستی کی کوشش کی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ مذکورہ عورت اپنی مرضی سے وہاں نہیں آئی تھی بلکہ اسے زبردستی چودھری کی عیاشی کے سامان کے طور پر وہاں پہنچایا گیا تھا۔ ایک خیال برق رفتاری سے میرے ذہن میں چمکا...... کہیں اسی عورت نے تو چودھری رستم کو موت کے

گھاٹ نہیں اتارا......؟

یہ ممکنات میں تھا۔ ان لمحات میں میرے رگ و پے میں خون کی گردش میں خاصی تیزی آگئی تھی۔ راشد اور منہاس کمرے کے باہر موجود تھے۔ میں نے انہیں اندر بلالیا پھر باری باری دونوں کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

''رات کو چودھری رستم کے ساتھ ڈیرے پر اور کون تھا؟''

''یہاں پر تو صرف قادو ہی ہوتا ہے۔'' منہاس نے جواب دیا۔ ''پچھلی رات بھی وہی تھا جناب۔''

میں نے اپنی ناک پر انگلی رکھ کر مخصوص انداز میں کہا۔ ''میں اس کی بات کر رہا ہوں۔ کون تھی وہ؟''

''آپ کسی عورت کا پوچھ رہے ہیں......'' راشد نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔

''ہاں!'' میں نے سپاٹ آواز میں کہا پھر ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے ٹکڑے انہیں دکھاتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔ ''یہ مجھے کمرے کے کچے فرش پر پڑے ملے ہیں، یقیناً پچھلی رات کوئی عورت یہاں موجود تھی اور چودھری نے شراب کے نشے میں اس کے ساتھ دست درازی بھی کی تھی۔ بتاؤ، کون تھی وہ؟''

''ہم کسی عورت کے بارے میں کچھ نہیں جانتے سرکار۔'' راشد نے منت ریز انداز میں کہا۔ ''اگر کوئی عورت رات کو ڈیرے پر آئی تھی تو قادو کو اس کا پتا ہوگا۔''

''تم جس قادو کا نام لے رہے ہو وہ خود ہمیشہ کے لیے لاپتا ہو چکا ہے۔'' میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''اب مجھے جو کچھ بھی بتانا ہے وہ آپ لوگوں ہی نے بتانا ہے۔ اگر تم لوگوں نے شرافت سے زبان نہیں کھولی تو تم دونوں طویل مدت کے لیے جاؤ گے سیدھے جیل میں۔''

''جناب! آپ ہماری بات کا یقین کریں۔'' منہاس گھگیایا۔ ''ہمیں واقعی اس معاملے کی کوئی خبر نہیں۔ قادو پر چھوٹے چودھری صاحب بہت اعتماد کرتے تھے۔ قادو ان کے ہر راز میں شریک تھا۔''

''مگر وہ شریک راز اب اس دنیا میں باقی نہیں رہا لہٰذا قادو سے پوچھ گچھ کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اور چودھری رستم کا انجام بھی تمہارے سامنے ہے۔ قادو کی لاش کو میں تم دونوں کے سامنے پوسٹ مارٹم کے لیے سرکاری اسپتال بھجوا چکا ہوں۔ تھوڑی دیر میں اسی مقصد کے لیے چودھری رستم کی لاش کو بھی روانہ کر دوں گا......'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''لاشوں کی چیر پھاڑ سے سارے حقائق کھل کر سامنے آجائیں گے۔ جب دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا تو پھر مجھ سے کسی رو رعایت کی توقع نہیں رکھنا اس لیے تمہارے حق میں یہی بہتر ہوگا کہ اگر تم اس واقعے کے بارے میں کچھ جانتے ہو تو مجھے سچ سچ بتادو۔''

میرے انداز میں واضح دھمکی موجود تھی۔ وہ دونوں منت سماجت کرنے لگے کہ ان کا اس اندوہناک واقعے سے کوئی تعلق واسطہ نہیں اور وہ پچھلی رات ڈیرے پر کسی عورت کی موجودگی سے بھی واقف نہیں ہیں۔ میں نے ان کا ابتدائی بیان نوٹ کر لیا۔ جس کے مطابق چھوٹا چودھری کبھی کبھار رات گزارنے ڈیرے پر آجایا کرتا تھا۔ اپنے ''آرام'' کی غرض سے رستم نے ڈیرے کے ایک کمرے کو شاہانہ انداز میں سیٹ کر رکھا تھا۔ وہ دونوں جانتے تھے کہ رستم شراب نوشی کرتا تھا اور وہ طبعاً عیاش بھی تھا لیکن وہ یہ بتانے سے قاصر تھے کہ گزشتہ رات ڈیرے پر کون عورت موجود تھی۔

راشد اور منہاس نے مجھے بتایا کہ عموماً چھوٹا چودھری رات کے کسی پہر یا صبح ہونے سے پہلے کسی وقت واپس حویلی پہنچ جایا کرتا تھا۔ آج صبح جب رستم علی حویلی کے اندر دکھائی نہیں دیا تو اس کی تلاش شروع ہوئی۔ اس بات کی کوئی تک نہیں بنتی تھی کہ چھوٹے چودھری کو فرید پور کے گھروں کے اندر ڈھونڈا جاتا۔ وہ ایک ہی جگہ پایا جا سکتا تھا اور وہ مقام تھا ڈیرا۔ چودھری سکندر علی نے راشد کو ڈیرے کی جانب دوڑایا۔ راشد اور منہاس کا شمار چودھری سکندر کے قابلِ اعتماد خدمت گاروں میں ہوتا تھا۔ وہ حویلی کے اندر مفلوج چودھری کا بہت خیال رکھتے تھے۔ راشد جب ڈیرے پر پہنچا تو قادو اسے کہیں دکھائی نہیں دیا۔ وہ چودھری کی کھوج میں جب اس کے لیے مخصوص کمرے میں داخل ہوا تو ایک خونچکاں منظر نے اس کا استقبال کیا۔ وہ بھاگم بھاگ حویلی پہنچا اور چودھری سکندر کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ اس اطلاع سے حویلی میں کہرام مچ گیا۔ چودھری سکندر نے دانش مندی کا ثبوت دیتے ہوئے راشد اور منہاس کو میری جانب دوڑا دیا تھا۔

میں مفلوج چودھری کے متحرک بندوں کے انٹرویو میں مصروف تھا کہ کانسٹیبل باسط کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

وہ انکشاف انگیز انداز میں بتا رہا تھا۔

''ملک صاحب! یہ دیکھیں...... مجھے کچھ ملا ہے۔''

میں فی الفور باسط کی طرف متوجہ ہوگیا۔ وہ ہاتھ میں ایک آہنی رینچ تھامے کھڑا تھا۔ مذکورہ پانے کا سائز کافی بڑا تھا۔ ایسے رینچ پانے ٹریکٹرز اور بھاری مشینری کے نٹ بولٹ کھولنے اور کسنے کے کام آتے ہیں۔ سب سے اہم اور دلچسپی کی بات یہ تھی کہ متذکرہ رینچ پانے کے ہیڈ پر جمے ہوئے خون کے آثار پائے جاتے تھے۔ میں نے جب پانے کے سر کا بغور جائزہ لیا تو جمے ہوئے خون کے اندر مجھے چند انسانی بال بھی چپکے ہوئے نظر آئے۔ اغلب امکان یہی تھا کہ اسی پانے کی طوفانی ضرب نے چودھری رستم کی کھوپڑی کا ستیاناس مار دیا تھا۔ پانے کے سر پر لگا ہوا خون سرد موسم کی وجہ سے جم گیا تھا۔ لیبارٹری ٹیسٹ سے بخوبی یہ پتا چلایا جاسکتا تھا کہ رینچ کے ہیڈ پر جما ہوا خون اور اس خون کے اندر چپکے ہوئے بال چودھری رستم کے ہی تھے یا کسی اور کے تھے۔ اس زمانے میں فنگر پرنٹس اٹھانے کا رواج عام نہیں ہوا تھا اور عدالت بھی اسے کوئی اہمیت نہیں دیتی تھی ورنہ اس رینچ کے دستے پر پائے جانے والے انگلیوں کے نشانات بہ آسانی قاتل تک راہنمائی کر سکتے تھے۔

''یہ تمہیں کہاں سے ملا؟'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں دریافت کیا۔

''یہ پلنگ کے سرہانے والی دیوار کے قریب پڑا ہوا تھا۔'' باسط نے بتایا اور بیان کردہ لوکیشن کی سمت اشارہ بھی کر دیا۔ ''مجھے لگتا ہے، ہم نے آلۂ قتل بازیاب کرلیا ہے۔''

''سرِ دست مجھے بھی یہی محسوس ہو رہا ہے۔'' میں نے باسط کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ ''اغلب امکان اسی بات کا ہے کہ اس رینچ کی کاری ضرب نے چودھری رستم کی زندگی کا چراغ گل کیا ہے تاہم حتمی رائے قائم کرنے کے لیے لیبارٹری رپورٹ کا انتظار کرنا ہوگا۔ تم اس آہنی رینچ کو اپنے پاس محفوظ کرلو۔''

کانسٹیبل باسط نے میرے حکم پر اپنے ساتھ لائے ہوئے ریگزین کے تھیلے میں مذکورہ رینچ کو بہ حفاظت رکھ دیا۔ اس کے بعد میں نے راشد اور منہاس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم جلد از جلد چودھری رستم کی لاش کو اسپتال بھجوانے کے لیے کسی سواری کا بندوبست کرو۔ جب تک میں دیگر کام نمٹاتا ہوں۔''

''گاؤں سے اس وقت بشیر کوچوان کا تانگا بہ آسانی مل سکتا ہے۔'' راشد نے بتایا۔ ''بشیر کوچوان کو رات سے تیز بخار ہے۔ آج اس نے تانگا نکالا ہی نہیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''تانگا، ریڑھا، بیل گاڑی...... جو بھی میسر ہو، فوراً یہاں لے آؤ تاکہ لاش کو اسپتال روانہ کیا جاسکے۔''

وہ دونوں میرے حکم کی تعمیل کرنے ڈیرے سے رخصت ہوگئے۔ ان کے جانے کے بعد میں اور باسط تفصیلی خانہ تلاشی میں مصروف ہوگئے۔

اس ڈیرے میں کُل تین کمرے ایک قطار میں بنے ہوئے تھے۔ درمیان والے کمرے کا میں اچھی طرح جائزہ لے چکا تھا۔ یہ وہی کمرا تھا جہاں ایک شاندار بیڈ پر چودھری رستم کی لاش پڑی ہوئی تھی اور اسی کمرے میں سے باسط نے آلۂ قتل بھی برآمد کرلیا تھا۔ اس کمرے میں مزید کسی ریسرچ کی ضرورت نہیں تھی۔

چودھری رستم مقتول کے بیڈروم کی ایک بغل میں قادو مقتول کا کمرا تھا اور دوسری بغل میں اسٹور روم یعنی تیسرا کمرا اسٹور روم کے طور پر استعمال ہو رہا تھا۔ مذکورہ کمرے میں مویشیوں کے چارے کے علاوہ چند زرعی آلات بھی رکھے دکھائی دیے۔ اغلب امکان اسی بات کا تھا کہ قاتل نے وہ آہنی رینچ یہیں سے اٹھایا ہوگا کیونکہ اسی نوعیت کے مختلف اوزار کمرے کے ایک کونے میں فرش پر پڑے نظر آرہے تھے۔

قادر عرف قادو کے زیرِ استعمال کمرے میں سے مجھے کوئی قابلِ ذکر چیز ہاتھ نہیں لگی جس کی مدد سے میں قاتل تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرسکتا۔ قانون کی نظر میں اس ڈیرے پر سے مجھے کام کی صرف تین چیزیں ہی ملی تھیں جن کی مدد سے میں تفتیش کی گاڑی کو آگے بڑھا سکتا تھا اور وہ تین چیزیں یہ تھیں۔ نمبر ایک، خون آلود سر والا آہنی رینچ، نمبر دو ٹوٹی ہوئی سرخ اور سبز چوڑیوں کے ٹکڑے، نمبر تین، چودھری سکندر علی کے اکلوتے سپوت چودھری رستم کی لاش۔

تھوڑی ہی دیر میں راشد اور منہاس بشیر کوچوان کا تانگا لے کر ڈیرے پر پہنچ گئے۔ اس وقت منہاس تانگے کو ''ڈرائیو'' کر رہا تھا۔ میں نے یہ اعزاز اسی کے پاس رہنے دیا اور چودھری رستم کی لاش کو تانگے پر رکھوا کر میں نے کانسٹیبل باسط کی نگرانی میں ضلعی اسپتال بھجوا دیا اور خود میں راشد کے ہمراہ چودھری سکندر کے پاس پہنچ گیا۔

چودھری سکندر علی ایک عمر رسیدہ، بے بس اور لاچار شخص تھا۔ فالج کے اٹیک نے پچھلے کچھ عرصے سے چودھری کو بستر تک محدود کر کے دوسرے انسانوں کا محتاج بنا دیا تھا۔ اس کے جسم کا نچلا حصہ بے جان اور ناکارہ ہو چکا تھا۔ راشد مجھے چودھری سکندر کے پاس پہنچا کر کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔

اس وقت چودھری کمرے میں اکیلا ہی تھا اور اس کی حالت خاصی ابتر ہو رہی تھی۔ فالج نے پہلے ہی اسے کافی مجبور کر رکھا تھا۔ اس پر اکلوتے بیٹے کی موت نے اسے اندر باہر سے توڑ ڈالا تھا۔ وہ بیڈ پر ٹیک لگائے نیم دراز بیٹھا خاموش آنسو بہا رہا تھا۔ میں اسے سلام کر کے پلنگ کے نزدیک رکھی کرسی پر بیٹھ گیا اور ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔

''چودھری صاحب! مجھے آپ کے جوان بیٹے کی موت کا بڑا دکھ ہے۔''

''آپ کے دکھی ہونے سے رستم واپس تو نہیں آجائے گا ملک صاحب!'' وہ پُرنم آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''چودھری صاحب! یہ ایک سفاک حقیقت ہے کہ آپ کا بیٹا جہاں چلا گیا ہے وہاں سے تو کوئی بھی اسے واپس نہیں لاسکتا۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''ہم سب کو اس سچائی کو تسلیم کرنا پڑے گا لیکن آپ سے میرا وعدہ ہے کہ میں بہت جلد رستم کے قاتل کو گرفتار کر کے اسے عبرت ناک سزا دلواؤں گا۔ اس مقصد کے لیے مجھے آپ کے تعاون کی ضرورت ہوگی۔''

''میرا سب کچھ ختم ہو گیا ملک صاحب۔'' وہ روہانسی آواز میں بولا۔ ''میری نسل آگے نہیں بڑھ سکے گی۔ میں بے اولاد، بے نام ونشان اس دنیا سے جاؤں گا......''

میں چودھری کی دلی کیفیت کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ اپنے کام کی معلومات حاصل کرنے کے لیے اس کی دلجوئی اور حوصلہ افزائی ضروری تھی۔ وہ جذباتی صدمے سے کسی حد تک باہر نکلتا تو تب ہی اس کے ساتھ سودمند گفتگو کی جاسکتی تھی۔

''آپ بے اولاد نہیں ہیں چودھری صاحب!'' میں نے اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔ ''ماشاء اللہ! آپ کی تین اولادیں اور بھی ہیں۔ وہ سب اور ان کی اولادیں آپ کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھیں گی۔''

''ملک صاحب! نسل ہمیشہ بیٹے سے چلتی ہے اور رستم میری اکلوتی اولادِ نرینہ تھا۔'' وہ سنبھلے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''رستم پچیس سال کا ہو چکا تھا۔ میں کافی عرصے سے اس کی شادی کرنے کا سوچ رہا تھا لیکن ہر بار کوئی نہ کوئی مسئلہ آڑے آجاتا تھا۔ شاید میرے نصیب ہی میں نہیں تھا کہ میری نسل آگے بڑھے۔ باقی جہاں تک میری دیگر اولادوں کی بات ہے تو......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک افسردہ سی سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''وہ تینوں میری بیٹیاں ہیں اور تینوں ہی شادی شدہ ہیں۔ ان سے پیدا ہونے والی اولادیں میری نسل میں شمار نہیں ہوں گی۔ سلمیٰ، خالدہ اور رفعت اپنے شوہروں کی نسل کو آگے بڑھائیں گی۔ رفعت، رستم سے پانچ سال چھوٹی ہے۔ مناسب وقت پر میں نے اس کی بھی شادی کر دی۔ بس، رستم ہی کا کچھ نہیں ہو رہا تھا۔ آہ...... انسان اپنے نصیب سے نہیں لڑسکتا۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں چودھری صاحب۔'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''واقعی، انسان اپنے نصیب اور نصیب بنانے والے سے کبھی نہیں جیت سکتا۔ اس کے فیصلوں کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا ہی پڑتا ہے۔''

''رخسانہ کی موت کے وقت میں کاتبِ تقدیر سے بہت لڑا تھا۔'' وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔ ''لیکن میری کوئی پیش نہیں چلی۔ وہ جیت گیا، میں ہار گیا، میری شریکِ حیات رخسانہ ہمیشہ کے لیے مجھ سے بچھڑ گئی تھی۔ رخسانہ کی موت نے مجھے توڑ ڈالا تھا اور...... رستم کی موت نے مجھے بکھیر کر رکھ دیا ہے۔''

میں چند لمحات تک چودھری سکندر کے ساتھ تسلی تشفی کی باتیں کرتا رہا۔ میری مخلصانہ اور ہمدردی بھری باتوں نے اس کے صدمے کو خاصی حد تک کم کر دیا۔ میں نے محسوس کیا چودھری کی ذہنی حالت اس حد تک ہموار اور سازگار ہو چکی ہے کہ اب اس کے ساتھ نہایت ہی اہم اور سنجیدہ گفتگو کی جاسکتی ہے۔

میں نے جائے وقوعہ پر جو کچھ دیکھا تھا اس کا خلاصہ چودھری سکندر کے گوش گزار کرنے کے بعد ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ''آپ کو کس پر شک ہے؟''

''آج صبح جب مجھے اس اندوہناک واقعے کی اطلاع ملی تو اس وقت میرا شک قادو کی طرف گیا تھا کیونکہ مجھے بتایا گیا تھا کہ قادو منظر سے غائب ہے۔'' چودھری

نقاہت بھرے انداز میں بولا۔ ''لیکن تھوڑی دیر پہلے راشد اور منہاس کی زبانی مجھے پتا چلا ہے کہ آپ کو قادو کی لاش مل گئی ہے جو فرید پور سے نہر کے پانی میں بہتے ہوئے آپ کے علاقے میں چلی گئی تھی۔''

میں سمجھ گیا کہ میں نے جب راشد اور منہاس کو سواری کا بندوبست کرنے بھیجا تھا تو انہوں نے چودھری سکندر کو تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کردیا تھا۔ میں نے چودھری کے ہاتھ کو بہ آہستگی بستر پر رکھا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''تو اس کا مطلب ہے، اب آپ کو قادو پر شک نہیں رہا؟''

''میرا شک پوری طرح رفع نہیں ہوا۔'' وہ صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ ''بلکہ اس شک کے ساتھ یہ سوال بھی نتھی ہوگیا ہے کہ قادو کو قتل کر کے کس نے نہر میں پھینکا؟''

''چودھری صاحب! آپ کے اس سوال اور اس سے جڑے دیگر درجنوں سوالات کے جوابات تلاش کرنے کے لیے مجھے آپ کی مدد درکار ہوگی۔'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔

''آپ حکم کریں۔'' وہ پُرعزم انداز میں بولا۔ ''میں ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہوں۔''

''قادو اور رستم کی موت دو مختلف انداز میں واقع ہوئی ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''قادو کی گردن کا منکا توڑ کر اسے سپردِ اجل کیا گیا ہے جبکہ رستم کی کھوپڑی کے عقبی حصے پر آہنی وزنی رینچ کا خطرناک وار کر کے اسے موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے۔ اس امر کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا کہ پہلے قادو نے رینچ کی مدد سے رستم کی جان لی اور جب وہ جائے وقوعہ سے فرار ہورہا تھا تو کسی نے اس کی گردن کا منکا توڑ کر، اس کی لاش کو نہر میں پھینک دیا۔''

''کس نے......؟'' چودھری سکندر نے اضطراری انداز میں استفسار کیا۔

میں نے اس کے سوال کا جواب دینا ضروری نہ سمجھا اور اپنی ہی دھن میں بولتا چلا گیا۔ ''چودھری صاحب!'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''اگر میں غلطی نہیں کررہا تو فرید پور کی آبادی تین سو افراد سے زیادہ نہیں ہوگی۔''

''آپ کا اندازہ درست ہے۔'' وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''فرید پور ایک چھوٹا گاؤں ہے۔ اس کی آبادی کم و بیش اتنی ہی ہوگی۔''

''کیا آپ ملازموں سے کہہ کر فرید پور کے تمام افراد کو حویلی میں بلا سکتے ہیں؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''صرف مرد و زن کو، بچوں کو یہاں لانے کی ضرورت نہیں۔''

''بالکل لاسکتا ہوں۔'' وہ بڑے اعتماد کے ساتھ بولا۔ ''اگر بچوں کو نکال دیا جائے تو یہ تعداد ویسے ہی گھٹ کر دو، سوا دو سو رہ جائے گی لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ آخر آپ کرنا کیا چاہ رہے ہیں؟''

''آپ پہلے فرید پور کے تمام جوان مرد اور عورتوں کو حویلی میں بلانے کے لیے احکامات صادر کریں پھر میں اپنا مقصد بھی آپ پر واضح کردوں گا۔'' میں نے پُرمعنی انداز میں کہا۔ ''آپ یوں سمجھیں کہ میں یہ سارا کشٹ قاتل کی تلاش کے سلسلے میں اٹھا رہا ہوں۔''

''تو آپ کے خیال میں رستم اور قادو کا قاتل فرید پور میں چھپا بیٹھا ہے؟'' چودھری نے عجیب سے لہجے میں سوال کیا۔

''اس بات کو خارج از مکان نہیں سمجھا جاسکتا۔'' میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''مجھے ایک مرد اور ایک عورت کی تلاش ہے۔ اگر میرے مطلوبہ یہ دونوں افراد مجھے مل جائیں تو میں پچھلی رات پیش آنے والے دہرے قتل کے سنگین واقعے کی تہ تک پہنچ سکتا ہوں۔''

''ہوں......'' چودھری نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تو یہ بات ہے......'' پھر اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''آپ کو کس قسم کے ایک مرد اور ایک عورت کی تلاش ہے؟''

''ایسا مرد جو شہ زور ہو۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''پہلوانی اور کبڈی کا ماہر...... شہ زوری کے تمام داؤ پیچ میں طاق چاق و چوبند......''

''فرید پور میں تو ایسا ایک ہی بندہ ہے ملک صاحب۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''اس کا نام صدیق ہے لیکن وہ ''کالا بھولا'' کے نام سے مشہور ہے۔ کچھ لوگ اسے ''کالا پہلوان'' بھی کہتے ہیں۔''

''اوہ...... تو یہ بھولا پہلوانی کرتا ہے؟'' میں نے چونکتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

''جی!'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''بھولا ہمارے گاؤں کی آبرو ہے ملک صاحب۔ آلے دوالے کے کسی گاؤں دیہات میں اس جیسا پھرتیلا اور

کوئی پہلوان نہیں ہے۔"

"بس تو پھر آپ مردوں میں صرف اسی پھرتیلے پہلوان کالا بھولا کو یہاں بلالیں۔" میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "میں بھولا سے معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ قادو کی گردن کا منکا توڑنے میں اسے... کتنا وقت لگا ہوگا......"

میرے آخری جملے نے چودھری سکندر علی کے چہرے پر سنسنی سی دوڑا دی۔ اس نے بے حد حیرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔ "کہیں آپ یہ تو نہیں سمجھ رہے کہ قادو کی گردن کا منکا بھولا نے توڑ کر اسے ہلاک کیا ہے؟"

"میں بھولا کے تفصیلی انٹرویو کے بعد ہی کسی حتمی نتیجے پر پہنچ پاؤں گا۔" میں نے سادہ سے لہجے میں کہا۔ "لیکن ایسا سوچنے میں فی الحال کوئی حرج بھی نہیں ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ......" میں نے جملہ نامکمل چھوڑ کر ڈرامائی انداز میں چودھری سکندر کی طرف دیکھا اور ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

"...کہ رستم کو بھی بھولا پہلوان ہی نے قتل کیا ہو۔"

"آپ ایک ناممکن بات کر رہے ہیں ملک صاحب۔" وہ بے یقینی سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "بھولا ایسی سنگین غلطی کبھی نہیں کر سکتا۔ وہ ایک نامور پہلوان ضرور ہے مگر اس کے اندر اتنی جرأت نہیں کہ وہ میرے بیٹے کی زندگی سے کھیلنے کے بارے میں کبھی خواب میں بھی سوچ سکے۔"

"میں نے ایسا کوئی دعویٰ نہیں کیا کہ بھولا پہلوان نے قادو یا رستم کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں نے ایک امکان کی جانب اشارہ کیا ہے۔"

"ٹھیک ہے، میں آپ کے حکم کے مطابق بھولا کو حویلی بلاتا ہوں۔" وہ مصلحت آمیز لہجے میں بولا۔ "اس سے پوچھ تاچھ کر کے آپ اپنی تسلی کر لیں۔"

"اور گاؤں کی تمام عورتوں کو بھی یہاں بلانا ہے چودھری صاحب!" میں نے یاد دہانی کرانے والے انداز میں کہا۔

اس نے راشد کو اپنے پاس بلا کر میرے حسبِ منشا ہدایات جاری کر دیں پھر میری جانب متوجہ ہوتے ہوئے الجھن زدہ لہجے میں بولا۔

"ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی ملک صاحب؟"

"کون سی بات؟" میں نے سرسری انداز میں پوچھا۔

"یہ آپ فرید پور کی عورتوں کو کس سلسلے میں لائن حاضر کر رہے ہیں؟"

"شناخت پریڈ کا سلسلہ ہے چودھری صاحب!" میں نے معنی خیز انداز میں جواب دیا۔

اس کی الجھن میں حیرت بھی شامل ہو گئی۔ "کس نوعیت کی شناخت پریڈ؟"

"مجھے ایک ایسی عورت کی تلاش ہے جو گزشتہ رات آپ کے بیٹے رستم علی کے ساتھ ڈیرے پر موجود تھی۔" میں نے انکشاف انگیز انداز میں بتایا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ملک صاحب......؟" وہ بے یقینی سے مجھے تکنے لگا۔

میں نے چودھری سکندر کو بتایا کہ ادھر ڈیرے پر رستم والے کمرے میں، میں نے کیا کیا دیکھا ہے۔ یہ سب تھوڑی دیر پہلے بھی میں اس کے گوش گزار کر چکا تھا تاہم اس وقت چودھری، رستم کی موت کے صدمے میں اس قدر غرق تھا کہ اس نے میری بات پر دھیان نہیں دیا تھا لیکن اب کی بار اس نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر تشویش بھرے لہجے میں بولا۔

"رستم کی مے نوشی تو میرے علم میں ہے لیکن اس عورتوں والے چکر کے بارے میں، میں کچھ نہیں جانتا۔"

"کیا کبھی قادو نے بھی آپ کو اس حوالے سے کچھ نہیں بتایا؟"

"نہیں!" وہ دوٹوک انداز میں بولا۔

"اس امر میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں کہ گزشتہ رات ڈیرے پر رستم علی کے ساتھ ایک عورت بھی موجود تھی۔" میں نے اپنے تجربے کو چودھری سکندر کے علم میں لاتے ہوئے کہا۔ "رستم شراب کے نشے میں چور تھا۔ لیبارٹری ٹیسٹ اور پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میری بات کی تصدیق کر دے گی۔ نشے کی حالت میں رستم نے اس عورت کے ساتھ دست درازی کی کوشش کی تھی جس کی وجہ سے عورت کی کئی چوڑیاں ٹوٹ گئیں۔ میرے خیال میں چار پانچ چوڑیاں تو لازمی ٹوٹی ہوں گی......" لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر ہری اور لال چوڑیوں کے درجن بھر ٹکڑے چودھری کو دکھاتے ہوئے ان الفاظ میں اپنی بات پوری کر دی۔

"ڈیرے پر رستم کے کمرے کے فرش سے میں نے چوڑیوں کے ان ٹکڑوں کو اٹھایا ہے۔ اب تو ساری کہانی آپ کی سمجھ میں آ گئی ہوگی؟"

"آپ کی بات تو میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں ملک

صاحب۔'' وہ پُرخیال انداز میں بولا۔ ''لیکن یقین نہیں آرہا کہ ایسا کچھ ہوا ہوگا۔''

''جب ٹھوس اور جیتا جاگتا ثبوت آپ کی آنکھوں کے سامنے اجاگر ہوگا تو پھر آپ کو یقین بھی آجائے گا۔'' میں نے پُروثوق لہجے میں کہا۔ ''میں نے فرید پور کی عورتوں کی شناخت پریڈ اسی مقصد سے رکھی ہے۔ اگر اس گاؤں کی کوئی عورت پچھلی رات رستم کے کمرے میں موجود تھی تو اس کی کلائیوں پر تازہ زخموں کے نشانات لازمی ہوں گے۔ یہ ممکن نہیں کہ اتنی چوڑیاں ٹوٹ جائیں اور کلائیوں پر خراش تک نہ آئے۔ آپ یقیناً میری بات کی تہ تک پہنچ گئے ہوں گے چودھری صاحب!''

اس نے تائیدی انداز میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔ میں نے کہا۔ ''شناخت پریڈ میں جس بھی عورت کی کلائی یا کلائیاں زخمی پائی جائیں گی، میں صرف اسی سے تفتیش کروں گا اور مجھے یقین ہے، وہ گھائل عورت اور بھولا پہلوان اس دہرے قتل کے معمے کو حل کرنے میں بہت معاون اور مفید ثابت ہوں گے۔''

اگلے ایک گھنٹے میں میرے مطالبے کو ادھورے انداز میں پورا کر دیا گیا۔ وہ اس طرح کہ بھولا پہلوان حویلی میں حاضر نہیں ہوسکا تھا۔ اس کے بارے میں پتا چلا کہ وہ آج صبح ایمن آباد چلا گیا تھا۔ ایمن آباد میں بھولا کی چاچی رہتی تھی۔ اس کی واپسی آئندہ روز متوقع تھی۔

میں نے حویلی میں بلائی جانے والی تمام عورتوں کی کلائیوں کو اچھی طرح چیک کیا تو پتا چلا کہ کسی ایک عورت کی کلائی پر بھی چوٹ یا زخم کا کوئی تازہ نشان موجود نہیں تھا۔ اس بات نے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا۔ میں نے تھوڑا وقت مزید صرف کر کے اس امر کی تسلی کر لی کہ گاؤں کی کوئی عورت چیکنگ سے رہ تو نہیں گئی۔

مجھے بتایا گیا کہ سوائے ایک عورت کے میں نے فرید پور کی وسنیک تمام عورتوں کی کلائیاں چیک کر لی ہیں۔ چیکنگ والا یہ پروسس حویلی کے کشادہ صحن میں جاری تھا۔ چودھری سکندر اس عمل میں شامل نہیں تھا۔ وہ حویلی کے اندر اپنے کمرے میں موجود تھا۔ میں نے ''ایک عورت'' کی خبر دینے والے سے استفسار کیا۔

''کون عورت چیکنگ کے مرحلے سے گزرنے سے رہ گئی ہے؟''

''اس کا نام نوری ہے۔'' مجھے بتایا گیا۔
میں نے پوچھا۔ ''نوری یہاں کیوں نہیں آئی۔ کیا وہ فرید پور میں موجود نہیں؟''
''نوری ماسی ادھر ہی ہے تھانے دار صاحب۔'' اس شخص نے جواب دیا۔ ''اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ اپنے گھر میں ہے۔''
''نوری ماسی'' کے الفاظ نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے پوچھا۔ ''نوری کی عمر کیا ہوگی؟''
''ماسی'' کا لفظ کراچی میں گھریلو ملازمہ یا نوکرانی کے لیے استعمال ہوتا ہے مگر گاؤں دیہات خصوصاً پنجاب کے گاؤں اور شہروں میں ماسی کا مطلب ہے خالہ۔ اگر کوئی عورت رشتے میں کسی کی خالہ نہ بھی ہو تو عموماً ادھیڑ عمر یا ضعیف عورتوں کو خالہ اور چاچی کہہ کر مخاطب کیا جاتا ہے۔ میں نے اسی نسبت سے نوری ماسی کی عمر کے بارے میں سوال کیا تھا۔
''نوری ماسی کی عمر پچاس کے اریب قریب ہے تھانے دار صاحب۔'' راشد نے مجھے بتایا۔ ''بس دونوں میاں بیوی ہی ہیں گھر میں۔ نوری کا گھر والا دین محمد عرف بابا دینا ایک اندھا انسان ہے۔ نوری ماسی ایک ہوشیار عورت ہے لیکن اس وقت طبیعت کی خرابی نے اسے چارپائی سے لگایا ہوا ہے، اسی سبب وہ یہاں نہیں آسکی۔''
نوری کی عمر کا سن کر میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔ نوری میری مطلوبہ عورت نہیں ہوسکتی تھی۔ رستم خود سے دگنی عمر کی عورت کے ساتھ رات گزارنے کا پروگرام نہیں بنا سکتا تھا تاہم میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔
''کوئی بات نہیں۔ میں خود نوری کے گھر جا کر اس کی طبیعت کی خبر لوں گا اور ساتھ ہی اس کی کلائیاں بھی چیک کرلوں گا۔ تم نوری کے گھر تک میری راہنمائی کرو گے۔''
''ٹھیک ہے تھانے دار صاحب۔'' وہ فرماں برداری سے بولا۔ ''جو آپ کا حکم۔ میں حاضر ہوں۔''
''میں ذرا چودھری صاحب سے ایک ضروری بات کرلوں۔'' میں نے کہا۔ ''پھر چلتے ہیں نوری کی طرف۔''
اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
میں حویلی کے اندرونی حصے میں چودھری سکندر علی کے پاس پہنچ گیا۔ ایک مرتبہ پھر بیٹے کی موت کے صدمے نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ ان لمحات میں وہ صدیوں کا بیمار نظر آرہا تھا۔ اس نے امید بھری نگاہ سے مجھے دیکھا اور غم زدہ لہجے میں استفسار کیا۔
''کچھ پتا چلا ملک صاحب......!''
''بہت جلد سب پتا چل جائے گا۔'' میں نے گول مول جواب دیا پھر کہا۔ ''آپ کے گاؤں کی عزت و آبرو بھولا پہلوان جیسے ہی ایمن آباد سے واپس آئے، آپ اسے میرے پاس تھانے بھیجیں گے۔ مجھے یقین ہے، بھولا سے پوچھ تاچھ کافی سودمند ثابت ہوگی۔''
''فرید پور کی عورتوں کی کلائیاں چیک کرنے سے آپ کو کام کی کوئی بات پتا چلی؟'' چودھری نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔
''ایک عورت کے سوا میں نے گاؤں کی تمام عورتوں کی کلائیاں اچھی طرح چیک کرلی ہیں۔'' میں نے بتایا۔ ''اور ان میں سے کسی ایک کی بھی کلائی پر تازہ زخم کے نشان حتیٰ کہ ایک خراش تک موجود نہیں ہے۔''
''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ پچھلی رات رستم کے ساتھ ڈیرے پر گاؤں کی کوئی عورت موجود نہیں تھی۔'' اس نے تصدیق طلب انداز میں کہا۔
''فی الحال تو یہی کہا جاسکتا ہے۔'' میں نے سرسری لہجے میں جواب دیا۔ ''لیکن یہ بات طے ہے کہ وقوعہ کی رات رستم کے کمرے میں کوئی عورت موجود تھی اور رستم نے اس کے ساتھ زور زبردستی کرنے کی بھی کوشش کی تھی جس کے نتیجے میں مذکورہ عورت کی چوڑیاں ٹوٹ گئی تھیں۔''
''لیکن آپ نے تو فرید پور کی ساری عورتوں کی کلائیوں کا معائنہ کرلیا ہے۔'' چودھری سکندر نے سوچتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھا اور کہا۔ ''کہیں آپ ایسا تو نہیں سمجھ رہے کہ وہ عورت کہیں اور سے لائی گئی تھی؟''
''کیا ایسا ہونا ناممکنات میں سے ہے؟'' الٹا میں نے چودھری سے سوال کر ڈالا۔
''نہیں، ایسا ہوسکتا ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''لیکن پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ کی مطلوبہ عورت گئی کہاں؟''
''میں اس سوال کا جواب بہت جلد تلاش کرلوں گا۔'' میں نے پُرعزم لہجے میں کہا۔ ''ایک بات میں کسی شک و شبے کی گنجائش تلاش نہیں کی جاسکتی کہ پچھلی رات ڈیرے پر رستم کے کمرے میں کوئی عورت موجود تھی اور مجھے اس بات کا بھی پکا یقین ہے کہ وہ عورت راضی خوشی اپنی مرضی سے وہاں نہیں گئی تھی۔ اگر اس شب بسری میں اس عورت کا ارادہ شامل ہوتا تو وہ رستم کی کسی بھی خرمستی کی مزاحمت نہ کرتی۔ رستم شراب کے نشے میں اس کے ساتھ جیسے بھی پیش آتا، وہ اسے

برداشت کرتی لہٰذا اس کی چوڑیاں ٹوٹنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا......"

"آپ کا تجزیہ میری سمجھ میں آرہا ہے ملک صاحب۔" وہ فکرمندی سے بولا۔ "آپ کی باتیں سن کر میں یہ سوچنے پر مجبور ہو رہا ہوں کہ کہیں اسی عورت نے تو رستم کی جان نہیں لی......؟"

"ایسا ہو سکتا ہے چودھری صاحب۔" میں نے اس کی سوچ کی تصدیق کرتے ہوئے کہا۔ "اسی لیے تو میں ایک مرد اور ایک عورت کی تلاش میں ہوں تاکہ رستم اور قادو کی پراسرار موت کا معما حل کیا جاسکے۔ عورت نے کسی کو قتل کیا یا نہیں لیکن وہ پچھلی رات رستم کے کمرے میں موجود ضرور تھی اور قادو کی گردن کا منکا جس مہارت کے ساتھ توڑ کر اسے موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے، وہ کسی شہ زور مرد کا کام ہے۔"

"اگر قادو نہ مارا جاتا تو اس عورت کے بارے میں ساری معلومات فراہم کرسکتا تھا۔" چودھری سکندر نے ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ "وہ رستم کے ساتھ سائے کی طرح لگا رہتا تھا۔ یوں سمجھ لیں کہ رستم قادو پر بڑا بھروسا کرتا تھا۔"

"آپ فکر نہ کریں چودھری صاحب۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "میں بہت جلد آپ کو کوئی خوش خبری سناؤں گا۔"

"میرے لیے سب سے بڑی سکون کی خبر... تو یہ ہوگی کہ رستم کا قاتل گرفتار ہو جائے اور اسے آپ عبرت ناک سزا دلوائیں۔"

"ایسا ہی ہوگا۔" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا اور جانے کے لیے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "اب مجھے اجازت دیں۔ میں بہت جلد دوبارہ حاضر ہوں گا۔"

"میں کتنا لاچار اور بدنصیب ہوں کہ آپ کو رخصت کرنے کے لیے حویلی کے گیٹ تک بھی نہیں جاسکتا۔" وہ بے بسی سے بولا۔

"کوئی بات نہیں چودھری صاحب۔" میں نے اسے دلاسا دیا۔ "میری دعا ہے کہ اللہ پاک جلد از جلد آپ کو صحت یاب کردے تاکہ آپ حویلی کے گیٹ تک ہی نہیں بلکہ اس گاؤں سے باہر آنے جانے کے قابل بھی ہو جائیں۔"

"اللہ آپ کی زبان مبارک کرے ملک صاحب!" وہ امید بھرے لہجے میں بولا۔

میں چودھری سکندر علی کو تسلی تشفی دینے کے بعد حویلی سے نکل آیا اور راشد کے ہمراہ ماسی نوری کے گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔

نوری کی عمر کے بارے میں جان لینے کے بعد اس امر کے امکانات صفر کے برابر رہ گئے تھے کہ گزشتہ شب وہ رستم کے کمرے میں ڈیرے پر موجود ہوگی لیکن یہ دو افراد کے پراسرار قتل کا معاملہ تھا لہٰذا تفتیش کے معمولی سے امکان کو نظر انداز کرنا ایک سنگین غلطی ہوتی۔ اگر نوری کی چیکنگ باقی رہ گئی تھی تو مجھے ہر حال میں اس کام کو مکمل کرنا تھا۔

راشد مجھے نوری کے گھر میں داخل کر کے خود باہر ہی رک گیا تھا۔ نوری کو خاصا تیز بخار تھا تاہم وہ اس قابل تھی کہ میں اس سے پوچھ تاچھ کرسکوں۔ نوری پچاس سے متجاوز ایک عام سی گھریلو عورت تھی۔ اس کی آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی۔ بخار کی زیادتی نے اسے خاصا کمزور کر دیا تھا۔ اس کا گھر والا بابا دینا بھی ایک چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ دین محمد نے میری آمد کا نوٹس نہیں لیا تھا۔ یا تو وہ سویا ہوا تھا اور یا پھر وہ اندھا ہونے کے علاوہ بہرہ بھی تھا۔ بعد ازاں مجھے پتا چلا کہ دین محمد پیدائشی اندھا نہیں تھا۔ اس کی نگاہ اس قدر کمزور ہو گئی تھی کہ اس کا شمار نابینا افراد ہی میں کیا جاسکتا تھا۔ دین محمد کی عمر ستر سے کچھ اوپر ہی تھی۔ یہ ایک بے اولاد جوڑا تھا۔

میں نے نوری کو اپنی آمد کی غرض و غایت سے آگاہ کرنے کے بعد کہا۔ "ماسی! میں تمہاری کلائیاں چیک کرنا چاہتا ہوں۔ ذرا اپنی آستینیں اوپر چڑھالو۔"

نوری قادو اور چودھری رستم کو پیش آنے والے واقعے سے آگاہ تھی۔ وہ میرے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے الجھن زدہ لہجے میں مستفسر ہوئی۔

"تھوڑی دیر پہلے ایک عورت مجھے بتا کر گئی ہے کہ آپ نے گاؤں کی ساری عورتوں کو چودھری صاحب کی حویلی میں بلا کر ان کی کلائیاں چیک کی ہیں۔ یہ کیا چکر ہے؟"

میں نے اس کی کلائیوں کا بغور معائنہ کرتے ہوئے گمبھیر انداز میں کہا۔ "ماسی! تمہیں بالکل ٹھیک بتایا گیا ہے۔ مجھے ایک ایسی عورت کی تلاش ہے جس کی کلائیوں پر تازہ زخموں کے نشان ہوں۔ وہ عورت پچھلی رات ڈیرے پر چودھری رستم کے کمرے میں موجود تھی۔"

پھر میں نے مختصر مگر جامع الفاظ میں نوری کو نامعلوم عورت کے ساتھ رستم کی دست درازی اور چوڑیوں کے ٹوٹنے کا قصہ سنا ڈالا۔ وہ بڑی توجہ اور دلچسپی سے میری بات سنتی رہی پھر اپنی کلائیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

"تو آپ اس بات کی تصدیق کے لیے یہاں آئے

ہیں کہ کہیں پچھلی رات ڈیرے پر چودھری کے ساتھ میں تو نہیں تھی؟''

اس کے سوال میں خفگی پائی جاتی تھی اور میں سمجھتا ہوں، وہ اپنے جذبات کے اظہار کا حق رکھتی تھی۔ میں نے اس کی تسلی اور اطمینان کی خاطر کہا۔

''نوری ماسی! پولیس کی تفتیش کی گاڑی شک کے پیٹرول سے چلتی ہے۔ یہ سب معمول کی پوچھ تاچھ ہے۔ اس علاقے میں دو جیتے جاگتے انسانوں کو بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ہے۔ مجھے ہر قیمت پر ان کے قاتل یا قاتلوں تک رسائی حاصل کرنا ہے۔ یہ چیکنگ اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ میں نے گاؤں کی تمام عورتوں کی کلائیوں کا معائنہ کیا ہے۔ اس حوالے سے تمہیں برا ماننے کی ضرورت نہیں۔ تمہاری کلائیوں پر زخموں کے نشانات نہیں پائے گئے۔ تم میری طرف سے کلیئر ہو۔''

''مجھے تو چوڑیاں پہنے ایک زمانہ ہو گیا ہے۔'' وہ کمزور مگر بے پروا لہجے میں بولی۔ ''آپ بتائیں، گاؤں کی کسی عورت کی کلائیوں پر آپ کو زخموں کے نشان ملے ہیں...... کہیں بھی نہیں نا؟''

تیز بخار کے باعث نوری کی جو حالت ہو رہی تھی اس میں سوال وجواب کرتے ہوئے مجھے ایک حد تک شرمندگی بھی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اس کی کلائیوں کی چیکنگ کے بعد یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اس کے گھر سے نکل جاؤں گا لیکن اس کے آخری جملے نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''تمہارا اندازہ درست ہے نوری۔ مجھے کسی بھی عورت کی کلائیوں پر تازہ زخموں کے نشان نہیں ملے لیکن تم نے اتنے وثوق کے ساتھ کیسے کہا ہے؟''

''میرے درست اندازے کا ایک سبب ہے تھانے دار صاحب!'' وہ سوچتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

میں نے پوچھا۔ ''کون سا سبب؟''

''اگر پچھلی رات واقعی ڈیرے پر چودھری رستم کے ساتھ کوئی عورت موجود تھی اور اس کی چوڑیاں بھی ٹوٹی تھیں تو پھر میرے خیال میں اس عورت کا تعلق فرید پور سے نہیں ہو سکتا۔''

میں نے اب تک اس معاملے کی جتنی تحقیق کی تھی، اس سے میں اسی نتیجے پر پہنچا تھا۔ گویا نوری میرے اندازے کی تصدیق کر رہی تھی مگر کیسے......؟ میں اس سے پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''نوری! تمہارے خیال میں اس عورت کا تعلق کسی اور علاقے سے ہے؟''

''جی، میرا یہی خیال ہے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

''اس خیال کی کوئی معقول وجہ تو ہوگی؟''

''جی۔'' اس نے ایک بار پھر اپنے سر کو اثباتی جنبش دی اور بولی۔ ''میں نے کل دن میں دو اجنبی عورتوں کو قادو سے باتیں کرتے دیکھا تھا۔''

نوری کی بات سن کر میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ میں نے اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔ ''تم نے ان دو عورتوں کو کہاں دیکھا تھا؟''

''ڈیرے کے نزدیک ہی نہر کے کنارے۔'' اس نے جواب دیا۔

''اوہ......!'' میں نے کھوجتی ہوئی نظر سے نوری کو دیکھا اور پوچھا۔ ''کیا تم مجھے بتا سکتی ہو کہ ان لوگوں کے بیچ کس نوعیت کی بات چیت ہو رہی تھی؟''

''نہیں جناب! میں اتنے فاصلے پر تھی کہ ان کی باتیں نہیں سن سکی۔'' وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولی۔ ''وہ دونوں عورتیں میرے لیے اجنبی تھیں۔ ان کا تعلق فرید پور سے نہیں تھا۔ میں ان پر ایک نگاہ ڈال کر آگے بڑھ گئی تھی۔''

نوری کے انکشاف نے میرے من میں کھلبلی مچا دی تھی۔ اس کی فراہم کردہ معلومات میری نظر میں گراں قدر اہمیت کی حامل تھیں۔ میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

''نوری! مجھے اس بات کا سخت افسوس ہے کہ تم بخار میں پھنک رہی ہو اور میں تم سے سوال پر سوال کیے جا رہا ہوں۔ تم میری مجبوری کو سمجھ سکتی ہو۔ یہ کوئی چوری، ڈکیتی یا راہزنی کا معمولی سا واقعہ نہیں۔ میں اس وقت دہرے قتل کے ایک سنگین سانحے کی تفتیش کر رہا ہوں۔ تمہارا تعاون مجھے قادو اور رستم کے قتل کا معما حل کرنے میں بہت مدد دے سکتا ہے۔''

''میں آپ کی ذمے داری کو سمجھ رہی ہوں تھانے دار صاحب۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''پوچھیں، آپ کو کیا پوچھنا ہے؟''

''یہ تو طے ہو گیا کہ کل تم نے جن دو عورتوں کو قادر کے ساتھ دیکھا تھا وہ فرید پور کی وسنیک نہیں ہیں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''بس تم مجھے ان عورتوں کے حلیوں کے بارے میں تفصیل سے بتا دو تاکہ انہیں تلاش کرنے میں مجھے آسانی ہو جائے۔ تم نے ان لوگوں کی

بات چیت نہیں سنی مگر ان عورتوں کی شکلیں تو غور سے دیکھی ہوں گی؟''

''جی دیکھی تھیں...... اور چونکہ وہ دونوں میرے لیے اجنبی تھیں اس لیے کچھ زیادہ ہی غور سے دیکھی تھیں۔'' نوری نے جواب دیا اور بتانے لگی۔ ''ان میں سے ایک عورت ادھیڑ عمر تھی اور اس کی رنگت گندمی تھی جبکہ دوسری ایک خوب صورت گوری چٹی جوان لڑکی تھی۔ لڑکی کا قد مناسب سے نکلتا ہوا تھا۔ اسے دراز قامت کہا جاسکتا تھا اور وہ دبلی پتلی تھی مگر اس کی ساتھی ادھیڑ عمر عورت پستہ قامت اور حد سے زیادہ موٹی تھی۔ اس کی لمبائی چوڑائی میں زیادہ فرق نہیں تھا۔ وہ ایک بڑے سائز کا فٹ بال نظر آتی تھی۔ میں اس سے زیادہ تفصیل آپ کو نہیں بتاسکتی۔ ان کے بارے میں، میرے ذہن میں جو کچھ تھا وہ میں نے آپ کو بتادیا ہے۔''

''یہ بھی کافی ہے نوری۔'' میں نے تشکر آمیز انداز میں کہا۔ ''تم نے ان عورتوں کے حلیوں اور قدو قامت کو بڑی وضاحت کے ساتھ میرے ذہن میں نقش کردیا۔ میں سرکاری آرٹسٹ سے ان کے خاکے بنوا کر انہیں تلاش کرنے کی کوشش کروں گا۔ تم سے بس میرا آخری سوال ہے......'' لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک اطمینان بھری سانس لی پھر اس سے پوچھا۔

''نوری! ان اجنبی عورتوں نے کس قسم کے لباس پہن رکھے تھے؟''

''گوری چٹی دراز قد لڑکی نے گرم پھول دار قمیص کے ساتھ کالی شلوار پہن رکھی تھی۔'' نوری نے بتایا۔ ''علاوہ ازیں اس نے کالے ہی رنگ کی گرم شال بھی اوڑھ رکھی تھی جبکہ اس کی ساتھی ادھیڑ عمر عورت نے گہرے بھورے رنگ کی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ اس موٹی عورت نے لباس کے اوپر نیلے رنگ کا اونی سویٹر بھی پہنا ہوا تھا۔ اس کے سر پر سفید دوپٹا تھا۔''

''بس ٹھیک ہے۔'' میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ''تمہاری بتائی ہوئی تفصیل سے کام چل جائے گا۔'' میں نے کہا۔ ''نوری! پولیس سے اس تعاون کے لیے میں تمہارا شکر گزار ہوں۔ اللہ پاک جلد از جلد تمہیں اس بخار سے نجات دلائے۔''

''آمین......!'' وہ دھیرے سے بولی۔

میں اس کے گھر سے نکل آیا۔ فرید پور میں میرا کام ایک لحاظ سے ختم ہوگیا تھا۔ اب مجھے پہلی فرصت میں دو اجنبی عورتوں کا سراغ لگانا تھا۔ اگر وہ دونوں یا ان میں سے کوئی ایک بھی میرے ہتھے چڑھ جاتی تو میں بہ آسانی قادو اور چودھری رستم کے قتل کے راز سے پردہ اٹھا سکتا تھا۔

جب میں تھانہ صدر پہنچا تو مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔ میں پچھلے اٹھارہ بیس گھنٹے سے مسلسل مصروف کار رہا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس دوران میں پیٹ پوجا کرنے کا تھوڑا بہت آسرا ہوگیا تھا لیکن آرام کرنے کا ذرا سا بھی موقع نہیں مل سکا تھا۔ میں تھک کر چُور ہوچکا تھا لہٰذا تھانے پہنچتے ہی ضروری اندراج کے بعد میں نے اپنے کوارٹر کا رخ کیا۔

☆☆☆

جیسا کہ میں نے ابتدا میں آپ کو بتایا تھا کہ وہ موسم سرما کے دن تھے اور دسمبر کا مہینا اپنا نصف سفر طے کرچکا تھا۔ میں دسمبر کی تاریخوں کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا چنانچہ واقعات کو ترتیب میں رکھنے کے لیے ہم فرض کرلیتے ہیں کہ میرے مخبر ریاست علی نے پندرہ دسمبر کو شونکا ڈنگر چور کے بارے میں مجھے اطلاع دی تھی کہ آئندہ رات وہ نہر کے راستے چوری شدہ مویشیوں کی ایک کثیر تعداد گوجرانوالہ کی مویشی منڈی پہنچانے والا ہے۔ سولہ دسمبر کی رات میں اور حوالدار نبی بخش نہر کے کنارے جھاڑیوں کے جھنڈ میں مورچا سنبھال کر شونکا کا انتظار کرنے لگے۔ شونکا کا مالِ مسروقہ یعنی تیس بھینسوں اور بارہ گائے کے ساتھ ہمارے ہاتھ لگا۔ علاوہ ازیں ہم نے سست روی سے رواں دواں نہر میں سے قادو کی گردن ٹوٹی ہوئی لاش بھی نکالی۔ آئندہ روز یعنی سترہ دسمبر کو میں تفتیش کی غرض سے فرید پور روانہ ہوا اور شام کو واپس آگیا۔

اگلی صبح یعنی اٹھارہ دسمبر کو میں نے سرکاری فوٹو گرافر اور ایک آرٹسٹ کو تھانے بلالیا۔ مذکورہ آرٹسٹ پین ورک میں یدِطولیٰ رکھتا تھا۔ میں اس سے پہلے بھی کئی بار اس سے مدد لے چکا تھا۔ اس کے بنائے ہوئے خاکے اصل شخصیت سے بہت قریب ہوتے تھے۔ اس آرٹسٹ کا نام نصیر علی تھا۔ میں نے نوری سے حاصل ہونے والے اجنبی عورتوں کے حلیوں اور قدو قامت کی تفصیلات نصیر اور آفتاب کو بتانے کے بعد کہا۔

''نصیر! تم ان دونوں عورتوں کے خاکے تیار کرو گے۔'' پھر میں نے اپنا روئے سخن سرکاری فوٹو گرافر کی جانب موڑتے ہوئے اضافہ کیا۔ ''آفتاب! تم نصیر کے بنائے ہوئے تصویری خاکوں کے درجن بھر پرنٹ تیار کرو گے۔ تم لوگ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

وہ بہ یک زبان ہوکر بولے۔ ''جی ملک صاحب۔ ہم اچھی طرح سمجھ گئے، آپ ہم سے کیا چاہتے ہیں۔''

''آج کا سورج غروب ہونے سے پہلے مجھے رزلٹ چاہیے۔'' میں نے تاکیدی نظر سے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھا۔
''آپ بے فکر ہو جائیں ملک صاحب۔'' نصیر نے کہا۔ آفتاب بولا۔ ''ہم آپ کو مایوس نہیں کریں گے۔''
میں نے انہیں رخصت کر دیا تو ایک کانسٹیبل نے میرے پاس آکر بتایا۔ ''ملک صاحب! شونکا آپ سے کوئی بات کرنا چاہتا ہے۔''
''تم لوگوں نے ان تینوں کی خاطر تواضع میں کوئی کمی تو نہیں چھوڑی۔'' میں نے معنی خیز نظر سے کانسٹیبل کی طرف دیکھا۔ ''جس کی شونکا مجھ سے شکایت کرنا چاہتا ہے۔''
''نہیں جناب! ہم نے ہر طرح سے شونکا اور اس کے ساتھیوں کا ''خیال'' رکھا ہوا ہے۔'' وہ میری بات کی تہ میں اترتے ہوئے باچھیں پھیلا کر بولا۔ ''لیکن لگتا ہے، ہماری مہمان نوازی اسے پسند نہیں آرہی۔ وہ آپ سے بات کر کے یہاں سے رخصت ہونا چاہتا ہے۔''
''یہاں سے رخصت ہو کر تو وہ سیدھا جیل جائے گا'' میں نے حتمی لہجے میں کہا۔ ''البتہ اس سے بات کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اسے یہاں لے کر آؤ۔''
پانچ منٹ کے بعد شونکا میرے سامنے حاضر تھا۔ اس کی حالت سے ظاہر ہوتا تھا کہ حوالات میں باقاعدگی کے ساتھ اس کی ''خاطر مدارات'' ہو رہی تھی۔ میں نے جب اس سے پوچھا کہ وہ مجھ سے کیا بات کرنا چاہتا ہے تو اس نے روتی دھوتی کہانی سنا کر مجھ سے معافی کی درخواست کی۔
''تھانے دار صاحب! میں وعدہ کرتا ہوں کہ مویشیوں کی چوری والا پیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دوں گا اور یہ تمام جانور بھی ان کے مالکان تک پہنچا دوں گا۔ بس، آپ مجھے معاف کر کے یہاں سے جانے دیں۔''
''یہ مذموم دھندا ترک کرنے میں تم کس حد تک راسخ العقیدہ ہو، یہ صرف خدا جانتا ہے یا تم جانتے ہو۔'' میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''یا پھر مستقبل قریب میں تمہارے کردار کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکے گا کہ تم اپنی زبان کے کتنے دھنی ہو۔''
''میں جو کہہ رہا ہوں، وہ سچ کر دکھاؤں گا۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔
''مگر میں تمہاری بات کا یقین کر کے تمہیں چھوڑ نہیں سکتا۔'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔
''آپ مجھے چھوڑ نہیں سکتے تو پھر حوالات میں رہتے ہوئے مجھے کام کرنے دیں۔'' وہ منت ریز لہجے میں بولا۔ ''میں ثابت کر دوں گا کہ جھوٹا نہیں ہوں۔''
میں نے الجھن زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''تم حوالات میں بیٹھ کر کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟''
''میں نے یہ بیالیس ڈنگر قرب و جوار کے گاؤں دیہات سے چوری کیے ہیں۔'' وہ اپنے منصوبے کی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''میں آپ کی قید میں رہ کر ان مویشیوں کے اصل مالکان تک انہیں پہنچا سکتا ہوں۔''
''کیا تم کسی قسم کا جادو جانتے ہو۔'' میں نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔ ''مجھے بے وقوف سمجھتے ہو؟''
''ایسی کوئی بات نہیں تھانے دار صاحب۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''میں اور میرے یہ دونوں ساتھی الیاس اور افضل اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہم نے کون سا ڈنگر کہاں سے چرایا ہے اور......''
''تو تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ......'' میں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی غصیلے انداز میں کہا۔ ''کہ میں تمہیں حوالات میں بند رکھ کر تمہارے دونوں ساتھیوں کو چوری کے جانوروں سمیت یہاں سے جانے دوں۔ یہ لوگ ان مویشیوں کو ان کے مالکان تک پہنچا کر واپس آئیں گے اور مجھے رپورٹ دیں گے کہ...... تھانے دار صاحب! ہم نے سب کے جانور واپس کر دیے۔ اب آپ ہمارے سرغنہ کو چھوڑ دیں تا کہ ہم شریفانہ زندگی کا آغاز کر سکیں۔ تمہارے ذہن میں یہی منصوبہ ہے نا؟''
''نہیں تھانے دار صاحب۔'' وہ نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔ ''میں آپ سے کچھ اور کہنا چاہتا ہوں۔ آپ میری بات تو سنیں۔''
''ٹھیک ہے، سناؤ۔'' میں نے کرخت لہجے میں کہا اور ٹٹو لنے والی نظر سے اسے تکنے لگا۔
''آپ میرے کسی ایک ساتھی کو اپنے عملے کے کسی ہوشیار بندے کے ساتھ یہاں سے جانے کی اجازت دے دیں۔'' وہ اپنی تجویز کی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''میرا بندہ آپ کے آدمی کی نگرانی میں ایک ایک مویشی کے مالک کو جا کر بتائے گا کہ اس کا جانور تھانے میں ہے۔ وہ جا کر وہاں سے وصول کر لے۔ اس طرح ہر شخص یہاں آکر اپنا جانور لے جائے گا یعنی تمام مویشی اپنے اصل مالکان تک پہنچ جائیں گے۔ اس کے بعد تو میں آپ سے اپنی خطائیں معاف کرانے کا حق رکھتا ہوں نا تھانے دار صاحب......!''

اس کی پیشکش سے نیک نیتی کی بو آتی تھی۔ میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ”شونکا! آج تو میں کسی اور معاملے میں الجھا ہوا ہوں اور یہ دن بے حد مصروف گزرے گا۔ تمہاری تجویز میں دم ہے۔ میں کل اس سلسلے میں تم سے بات کروں گا۔“

وہ حد سے زیادہ میرا شکریہ ادا کرنے لگا۔ میں نے اسے واپس حوالات میں بھیج دیا اور حوالدار نبی بخش کو اپنے پاس بلا کر ہدایت کردی کہ شونکا اور اس کے دونوں ساتھیوں کو دال روٹی پر ٹرخائیں۔ ان کی زیادہ ”خاطریں“ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

”جو حکم ملک صاحب۔“ وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ ”میں نے شونکا سے اپنا قرض مع سود وصول کرلیا ہے۔“

”تم کون سے قرض کی بات کر رہے ہو نبی بخش؟“ میں نے چونک کر حوالدار کی طرف دیکھا۔ ”کیا تم نے پہلے سے اسے کوئی رقم دے رکھی ہے......“

”نہیں ملک صاحب، ایسی کوئی بات نہیں۔“ وہ ذومعنی انداز اختیار کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ رقم کا نہیں، کوئی دوسرا حساب کتاب ہے۔ اس کمبخت کے انتظار میں اس برفیلی رات میرا ایک ایک جوڑ اکڑ کر رہ گیا تھا۔ میں نے شونکا کے ایک ایک جوڑ پر اپنے ہاتھ پاؤں کی طبع آزمائی کر کے دل کی بھڑاس نکال لی ہے۔“

”تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب قادو کی پوسٹ مارٹم شدہ لاش اسپتال سے یہاں پہنچے گی تو میں اسے بھی تھوڑی دیر کے لیے تمہارے حوالے کردوں۔“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”اس رات قادو کی لاش کو نہر سے نکالتے وقت بھی تمہیں بے پناہ سردی لگی تھی اور تمہارا آدھے سے زیادہ لباس بھی بھیگ گیا تھا۔ قادو کی لاش سے حساب چکتا کرنے کے لیے بھی تمہارے من میں بہت سے ارمان مچل رہے ہوں گے...... ہیں نا؟“

میری اس گہری چوٹ پر وہ شرمندہ ہو کر رہ گیا۔

دوپہر کے بعد بھولا پہلوان مجھ سے ملنے تھانے چلا آیا۔ اس کا اصل نام صدیق تھا مگر وہ بھولا پہلوان کے نام سے مشہور تھا۔ کچھ لوگ اسے کالا بھولا یا کالا پہلوان بھی کہتے تھے اور اس سے ملاقات کے بعد مجھے اس ٹائٹل کا سبب بھی معلوم ہوگیا۔ وہ ایک صحت مند گبرو جوان تھا جیسا کہ عموماً شہ زور ہوا کرتے ہیں مگر اس کی رنگت سیاہ تھی۔

بھولا بہت ہی سادہ مزاج انسان تھا۔ چودھری سکندر نے اس کے بارے میں مجھے جو کچھ بتایا، وہ من وعن درست تھا۔ میں لگ بھگ آدھے گھنٹے تک گھما پھرا کر بھولا سے مختلف نوعیت کے سوالات کرتا رہا۔ اس دوران میں فنِ پہلوانی اور مختلف داؤ پیچ بھی زیرِ بحث آئے۔ جب مجھے یقین ہوگیا کہ بھولا کسی بھی طور قادو کے قتل میں ملوث نہیں اور نہ ہی رستم کی موت میں اس کا ہاتھ ہے تو میں نے اسے جانے کی اجازت دے دی تاہم اس پر نفسیاتی دباؤ رکھنے کی غرض سے میں نے کہا۔

”بھولا! میں اس وقت تو تمہیں جانے دے رہا ہوں لیکن جب بھی بلاؤں، تمہیں تھانے آنا ہوگا اور اس دوران میں تم تھانے میں پیشگی اطلاع دیے بغیر فرید پور سے باہر کہیں نہیں جاؤ گے۔“

”ٹھیک ہے تھانے دار صاحب۔“ وہ اپنی گردن کو فرماں بردارانہ جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ”آپ جیسا کہہ رہے ہیں، میں ویسا ہی کروں گا۔“

”قادو کی لاش تو نہر کے پانی میں بہتی ہوئی یہاں تک پہنچی تھی۔“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے تیکھے انداز میں کہا۔ ”اس کی گردن پر سے قاتل کی انگلیوں کے نشانات دھل دھلا گئے تھے لیکن جو رینچ پانا ٹیسٹ کے لیے لیبارٹری گیا ہوا ہے اس کے دستے پر قاتل کی انگلیوں کے نشانات موجود ہیں۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟“

”جی تھانے دار صاحب! میں سمجھ رہا ہوں۔“ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ بولا۔ ”مجھے یقین ہے کہ اس رینچ کے دستے پر آپ کو میری انگلیوں کے نشانات نہیں ملیں گے۔“

”اللہ کرے ایسا ہی ہو۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں بھی نہیں چاہتا کہ تم کسی مصیبت میں پھنسو۔ تم ایک اچھے انسان ہو اور اس سے بڑھ کر یہ کہ تم فرید پور کی آبرو ہو۔ وہاں کے وسنیکوں کو تم پر بڑا مان ہے۔“

”آپ فکر نہ کریں تھانے دار صاحب۔“ وہ معتدل انداز میں بولا۔ ”میں فرید پور کی آبرو پر کبھی کوئی حرف نہیں آنے دوں گا اور وہاں کے وسنیکوں کا مان بھی سدا قائم ودائم رہے گا۔“

”شاباش!“ میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”مجھے امید ہے کہ تم جیسا کہہ رہے ہو ویسا کر کے بھی دکھاؤ گے۔“

اس نے میری ہدایت پر عمل کرنے کا وعدہ کیا اور رخصت ہوگیا۔

انگلیوں کے نشانات والی بات میں نے اس پر دباؤ رکھنے کے لیے کہی تھی ورنہ جیسا کہ میں نے پہلے بتایا، اس

زمانے میں فنگر پرنٹس اٹھانے کا رواج عام نہیں ہوا تھا۔ بعض اوقات حالات کے تقاضوں کے مطابق معاملات کو نمٹانے کے لیے ہمیں تھوڑی بہت غلط بیانی سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔

سہ پہر میں دونوں پوسٹ مارٹم شدہ لاشیں اسپتال سے تھانے پہنچا دی گئیں۔ پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ نے میرے تمام تر اندازوں کی تصدیق کردی تھی۔ قادر عرف قادو کی موت گردن کا منکا ٹوٹنے ہی سے واقع ہوئی تھی اور اس کی فوری موت کا وقت سولہ دسمبر کی رات دس اور بارہ بجے کے درمیان بتایا گیا تھا۔ دوسرے مقتول یعنی چودھری رستم کی موت کا بھی یہی وقت بتایا گیا تھا۔ یعنی ان دونوں مالک اور ملازم کو یکے بعد دیگرے ہلاک کیا گیا تھا۔ یہ بتانا مشکل تھا کہ ان میں سے پہلے کس کی موت واقع ہوئی تھی اور کس کی بعد میں بہرحال ان دونوں کو وقوعہ کی رات دس اور بارہ کے بیچ موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ جیسا کہ میں نے نہر کے پانی کی رفتار کے حساب سے اندازہ لگایا تھا کہ قادو کو لگ بھگ رات ساڑھے دس بجے ہلاک کیا گیا ہوگا۔ اس کا یہی مطلب تھا کہ وہ دونوں دس اور گیارہ بجے کے درمیان اس دنیا سے رخصت ہوئے تھے۔

کیمیکل ایگزامنر کی رپورٹ کے مطابق بہ وقتِ رخصت رستم شراب کے نشے میں دھت تھا۔ اس کے معدے سے بھی مے نوشی کے بڑے واضح ثبوت ملے تھے۔ نشے ہی کی حالت میں عقب سے اس کی کھوپڑی پر بھاری آہنی رینچ پانے سے وار کرکے اسے موت کی نیند سلا دیا گیا تھا۔ آلۂ قتل یعنی رینچ کے سر پر جو خون لگا ملا تھا وہ رستم کے خون سے میچ کر گیا تھا اور اسی خون کے اندر چپکے ہوئے بالوں کا جب رستم کے بالوں سے موازنہ کیا گیا تو یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ وہ رستم ہی کے بال تھے۔ میں نے ضروری قانونی کارروائی کے بعد دونوں مقتولین کی لاشوں کو راشد، منہاس اور اپنے عملے کے ایک شخص کی نگرانی میں شام سے پہلے موضع فرید پور روانہ کردیا۔ راشد اور منہاس آج دوپہر کے بعد ایک تانگے پر سوار ہوکر تھانے آئے تھے۔ ان کی آمد کا مقصد لاشوں کی وصولی ہی تھا۔

پوسٹ مارٹم اور لیبارٹری ٹیسٹ کی رپورٹ نے اگرچہ میرے اندازوں کی تصدیق کردی تھی تاہم تفتیش کی گاڑی بیابان علاقے میں ایک ویران اسٹیشن پر پہنچ کر رک گئی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ اس گاڑی کو آگے کس سمت لے جاؤں۔ میں اس تفتیشی گاڑی کا ڈرائیور تھا اس لیے تمام تر سوچ بچار بھی مجھے ہی کرنا تھی۔

نوری ماسی کی فراہم کردہ معلومات میں میرے لیے روشنی کی ایک کرن موجود تھی۔ اگرچہ وہ تیز بخار کی لپیٹ میں تھی تاہم اس سے ہونے والی ملاقات لاحاصل نہیں رہی تھی بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ابھی تک میری تفتیش کا حاصل یہ ملاقات ہی تھی تو بے جا نہ ہوگا۔ نوری ماسی نے سولہ دسمبر کی دوپہر میں دو عورتوں کو نہر کے کنارے ڈیرے کے نزدیک قادو کے ساتھ باتیں کرتے دیکھا تھا اور اسی رات یہ دونوں افراد موت کے گھاٹ اتار دیے گئے تھے اور چودھری رستم کے کمرے میں بھی کسی عورت کی موجودگی کے ناقابلِ تردید ثبوت ملے تھے۔ یہ بھی ثابت شدہ تھا کہ وقوعہ کی رات رستم کے کمرے میں پائی جانے والی عورت کا تعلق فرید پور سے نہیں تھا۔

گھوم پھر کر معاملہ انہی دو اجنبی عورتوں پر آکر ٹھہر جاتا تھا جن میں ایک پستہ قامت اور حد سے زیادہ موٹی تھی جبکہ دوسری دراز قد، گوری چٹی اور دبلی پتلی تھی۔ میں نے اپنے لوگوں سے ان دونوں عورتوں کے درجن بھر خاکے تیار کروالیے تھے جن کی مدد سے مجھے ان دونوں کو تلاش کرنا تھا۔ اگر وہ دونوں یا ان میں سے کوئی ایک بھی میرے ہتھے چڑھ جاتی تو دہرے قتل کی اس واردات کا معما حل ہوسکتا تھا۔

یہ بات تو طے ہوگئی تھی کہ ان کا فرید پور سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا کہ وہ کسی اور علاقے سے وہاں پہنچی تھیں۔ ایک سوال یہ بھی تھا کہ اگر وہ مقتول قادو کے ساتھ باتیں کررہی تھیں تو کیا قادو انہیں جانتا تھا؟ اس سوال کا سب سے مناسب جواب تو قادو ہی دے سکتا تھا لیکن وہ ہمیشہ کے لیے سوال و جواب کی پہنچ سے نکل چکا تھا لہٰذا یہ جواب بھی مجھے ہی تلاش کرنا تھا۔ آئندہ روز کی منصوبہ بندی کرتے ہوئے میں تھانے سے اٹھ کر اپنے کوارٹر میں چلا گیا۔

☆☆☆

انیس دسمبر کی صبح میں نے مذکورہ دونوں نامعلوم عورتوں کے خاکوں کو اپنے بندوں کو حوالے کرکے انہیں تلاش کی مہم پر روانہ کردیا۔ اگر وہ فرید پور کی رہنے والی نہیں تھیں تو ایک امکان یہ بھی تھا کہ اردگرد کے کسی گاؤں سے ان کا تعلق ہوگا اور یہ بھی ہوسکتا تھا کہ وہ کسی اور ضلع سے آئی ہوں۔ اس پوائنٹ کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے اپنے اہلکاروں کو خصوصی ہدایات دی تھیں کہ وہ ریلوے اسٹیشن،

بس اسٹینڈ اور تانگا اسٹینڈ وغیرہ کو خاص طور پر چیک کریں۔ اگر ان کا تعلق کسی اور علاقے یا کسی اور شہر سے تھا تو ان مقامات پر لازمی کسی نے انہیں دیکھا ہوگا۔

میری اختیار کی ہوئی حکمتِ عملی کارگر ثابت ہوئی۔ دوپہر سے پہلے ایک کانسٹیبل نے آکر مجھے بتایا۔

"ملک صاحب! ان عورتوں کا مسئلہ تو حل ہوگیا۔"

مذکورہ کانسٹیبل کا نام رفیق تھا اور وہ ایسے اطمینان بھرے انداز میں یہ اطلاع دے رہا تھا جیسے وہ نامعلوم عورتوں کو کہیں سے پکڑ کر لے آیا ہو۔ میں نے گہری سنجیدگی سے استفسار کیا۔

"کہاں ہیں وہ دونوں؟"

"جج...... جی......" وہ میرے سوال پر گڑبڑا کر رہ گیا۔

"رفیق! میں تم سے ان عورتوں کے بارے میں پوچھ رہا ہوں جن کا مسئلہ تم نے حل کرلیا ہے؟" میں نے تیز نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

"جناب! میرا مطلب تھا کہ ان کے بارے میں پتا چلا ہے۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "انہیں ریلوے اسٹیشن پر دیکھا گیا ہے۔"

"کس نے دیکھا ہے؟" میں سیدھا ہوکر بیٹھ گیا۔ "تفصیلات کیا ہیں؟"

"ملک صاحب! اسٹیشن ماسٹر نے انہیں چودہ دسمبر کو وہاں پلیٹ فارم پر دیکھا تھا۔" رفیق نے بتایا۔

"پھر......؟" میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

"پھر کچھ بھی نہیں جناب۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ "پھر وہ دونوں کہیں چلی گئی تھیں۔ کسی کو نہیں معلوم، وہ کہاں گئیں......"

مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ کانسٹیبل رفیق سے مزید سوال و جواب، وقت ضائع کرنے کے مترادف تھا لہٰذا میں فی الفور ریلوے اسٹیشن کی جانب روانہ ہوگیا۔

میرے تھانے سے ریلوے اسٹیشن کم و بیش آدھے میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ مجھے وہاں پہنچنے میں چند منٹ لگے ہوں گے۔ میں چاہتا تو کسی سینئر اہلکار کو اسٹیشن ماسٹر سے معلومات حاصل کرنے بھیج سکتا تھا لیکن میں نے خود ہی یہ مہم سر کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ پچھلے دو روز سے اس کیس نے میرے ذہن کو بہت منتشر کر رکھا تھا۔

اسٹیشن ماسٹر بڑے تپاک سے ملا اور میرے لیے گرما گرم چائے کا آرڈر دے دیا۔ اس وقت کسی ٹرین کی آمد کا وقت نہیں تھا لہٰذا اس کے پاس بات چیت کے لیے مہلت تھی۔ ہم بہ آسانی اس سنگین معاملے پر گفتگو کرسکتے تھے۔ جب میں نے اسٹیشن ماسٹر کو اپنی غرض و غایت کے بارے میں بتایا تو وہ خوش اخلاقی سے بولا۔

"ملک صاحب! میں ان دونوں کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا تاہم مجھے جتنا معلوم ہے، اگر وہ آپ کے کام آسکتا ہے تو مجھے خوشی ہوگی۔ ویسے اتنا بتادوں کہ ان دونوں کا آپس میں کوئی تعلق نہیں تھا۔"

"آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔" میں نے الجھن زدہ نظر سے اسٹیشن ماسٹر کی طرف دیکھا۔ "اگر ان کا آپس میں کوئی تعلق نہیں تھا تو پھر وہ ایک ساتھ کیوں تھیں؟"

"وہ لڑکی غلطی سے اس اسٹیشن پر اتر گئی تھی۔" اسٹیشن ماسٹر نے بتایا۔ "وہ پریشان تھی۔ اسی دوران میں یہ موٹی عورت اسے مل گئی۔" اس نے اسکیچ کی جانب اشارہ کیا۔ "وہ دونوں پلیٹ فارم کی ایک بینچ پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگیں۔ اس کے بعد اٹھ کر کہیں چلی گئیں۔"

"ہوسکتا ہے، یہ موٹی عورت اس لڑکی کی کوئی جاننے والی ہو۔" میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔ "اور وہ لڑکی کو اپنے ساتھ لے گئی ہو۔"

"ہاں...... ایسا ہوسکتا ہے۔" اس نے گول مول بات کی۔

اگرچہ اسٹیشن ماسٹر نے میری بات کی تائید کی تھی لیکن "ایسا ہوسکتا ہے" سے میرا کام نہیں چل سکتا تھا۔ مجھے ان دونوں نامعلوم عورتوں کا سراغ لگانا تھا اور یہ اسی وقت ممکن تھا جب مجھے ان کے بارے میں معلومات حاصل ہوتیں۔ میں نے اسٹیشن ماسٹر سے پوچھا۔

"آپ نے بتایا ہے کہ وہ لڑکی غلطی سے اس اسٹیشن پر اتر گئی تھی۔ کیا آپ نے اس سے پوچھا تھا کہ وہ کہاں سے آرہی تھی اور اسے جانا کہاں تھا؟"

"جس گاڑی میں سے وہ اتری تھی وہ راولپنڈی سے لاہور کی سمت جارہی تھی۔" اسٹیشن ماسٹر وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "میری ڈائریکٹ اس لڑکی سے بات نہیں ہوئی اس لیے اس کے سفر کے آغاز اور اس کی منزل کے بارے میں، میں آپ کو ٹھیک سے نہیں بتا سکتا۔ مجھے اپنے عملے کی زبانی پتا چلا تھا کہ وہ غلطی سے اس اسٹیشن پر اتر گئی تھی پھر اسے وہ موٹی عورت مل گئی۔ دونوں تھوڑی دیر تک پلیٹ فارم کی بینچ پر بیٹھ کر باتیں کرتی رہیں۔ پھر یہاں سے رخصت ہوگئیں۔"

"اس بات کا تو آپ کو یقین ہے ناکہ وہ آپ کے

اسٹیشن سے کسی ٹرین پر سوار نہیں ہوئی تھیں؟'' میں نے حفظِ ماتقدم کے طور پر پوچھ لیا۔

''نہیں ملک صاحب!'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''مجھے یہی بتایا گیا ہے کہ وہ تھوڑی دیر گفتگو کرنے کے بعد اسٹیشن کی بلڈنگ سے باہر نکل گئی تھیں۔''

میں نے اسٹیشن ماسٹر کے تعاون اور چائے کا شکریہ ادا کیا اور اس کے کمرے سے نکل آیا۔

اسٹیشن ماسٹر سے حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں، میں نے پلیٹ فارم پر گھوم پھر کر اپنے طور پر بعض لوگوں سے پوچھ تاچھ بھی کی جو کہ کافی مفید ثابت ہوئی۔ ایک قلی نے مجھے بتایا کہ اسٹیشن سے نکل کر وہ دونوں عورتیں تانگا اسٹینڈ کی جانب گئی تھیں۔

یہ جن دنوں کا واقعہ ہے اس زمانے میں آج کی طرح تانگا اسٹینڈز پر تانگوں کا میلا نہیں لگا رہتا تھا۔ تانگوں کی محدود تعداد ہوا کرتی تھی جو اپنے کام کے لحاظ سے مسافروں کو ریلوے اسٹیشن، لاری اڈا اور شہر کے دوسرے حصوں سے گردونواح کے گاؤں دیہات تک پہنچایا کرتے تھے۔

اس وقت اسٹینڈ پر صرف ایک تانگا سواریوں کے انتظار میں کھڑا تھا۔ اسٹیشن کی عمارت سے نکل کر میں نے تانگا اسٹینڈ کا رخ کیا۔

میں اس وقت سرکاری وردی میں تھا۔ تانگا اسٹینڈ پر چائے سگریٹ کے کھوکھے والے اور پھل فروش مجھے دیکھتے ہی الرٹ ہوگئے۔ میں نے ان کے سلام کا جواب دیتے ہوئے خالی تانگے کی جانب قدم بڑھا دیے۔ کوچوان نے مجھے اپنی طرف آتے دیکھا تو باادب، باملاحظہ، ہوشیار ہوکر کھڑا ہوگیا۔ میں اس کے نزدیک پہنچا تو وہ بڑے احترام سے بولا۔

''سرکار! حکم کریں۔ آپ کو کہاں لے چلوں؟''

میں نے اپنا گھوڑا اسٹیشن کی عمارت کی ایک دیوار کے ساتھ باندھ رکھا تھا اور چہل قدمی کرتے ہوئے تانگا اسٹینڈ کی سمت بڑھا تھا۔ میں نے کوچوان کی پیشکش کے جواب میں کہا۔

''چاچا! تمہارا نام کیا ہے؟''

''کرامت علی۔'' اس نے بتایا۔

کرامت کی عمر ساٹھ کے اریب قریب تھی۔ میں نے اس کے بالکل قریب پہنچ کر کہا۔ ''چاچا! فی الحال تو میں تم سے چند باتیں کرنے آیا ہوں۔ اگر میرا مقصد پورا نہیں ہوا تو پھر کہیں جانے کے بارے میں بھی سوچا جاسکتا ہے۔''

''جی...... ضرور۔ میں حاضر ہوں۔'' وہ فرماں برداری سے بولا۔ ''آپ پوچھیں جی۔''

میں اسے اس کے تانگے میں لے کر بیٹھ گیا اور ان نامعلوم عورتوں کے خاکے کا پرنٹ اسے دکھاتے ہوئے کہا۔

''مجھے ان دونوں کی تلاش ہے۔ یہ آج سے چار پانچ دن پہلے لگ بھگ اسی وقت اسٹیشن سے نکل کر تانگا اسٹینڈ کی طرف آئی تھیں پھر تمہارے تانگے پر سوار ہوکر کہیں چلی گئی تھیں۔ بتاؤ، تم نے انہیں کہاں پہنچایا تھا؟''

بات ختم کرتے ہی میں نے اپنی نگاہ کرامت علی کے چہرے پر گاڑ دی۔ آخری جملہ میں نے کوچوان کو چکر دینے کے لیے بولا تھا تاکہ اگر وہ انہیں جانتا ہو یا چودہ دسمبر کو اگر اس نے ان دونوں کو کہیں دیکھا ہو تو میں اس کے چہرے پر نمودار ہونے والے تاثرات سے کوئی نتیجہ اخذ کرسکوں۔

''آپ کی بات ایک حد تک درست ہے تھانے دار صاحب۔'' وہ معتدل انداز میں بولا۔ ''میں نے چودہ تاریخ کو لگ بھگ اسی وقت انہیں یہاں دیکھا تھا لیکن یہ میرے تانگے میں نہیں بیٹھی تھیں۔''

میں نے اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔ ''تو پھر کس کے تانگے پر سوار ہوئی تھیں؟''

''غلام عباس کے تانگے پر۔'' اس نے بڑی رسان سے جواب دیا۔ ''انہیں چھچھر والی جانا تھا اور میں اس طرف جاتا نہیں۔ میں نے اپنا روٹ جی ٹی روڈ کے اوپر ہی رکھا ہوا ہے۔''

''تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ غلام عباس والی کے روٹ پر چلتا ہے؟'' میں نے تصدیق طلب نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''جی بالکل!'' وہ دوٹوک انداز میں بولا۔ ''غلام عباس چھچھر والی ہی کا رہنے والا ہے اس لیے وہ چھچھر والی اور گوجرانوالہ شہر کے بیچ تانگا چلاتا ہے۔''

کرامت علی نے مجھے گراں قدر معلومات بہم پہنچائی تھیں۔ ان دونوں نامعلوم عورتوں کے حوالے سے اب میں بالکل ہی لاعلم نہیں رہا تھا۔ میں نے کوچوان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اس وقت غلام عباس کہاں ملے گا؟''

''وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو تانگا لے کر اسٹینڈ سے نکلا ہے۔'' کرامت علی نے بتایا۔ ''اس وقت وہ چھچھر والی کے آدھے راستے میں ہوگا۔''

''کیا غلام عباس کوئی اور پھیرا اٹھانے ریلوے

اسٹیشن کی طرف آئے گا؟'' میں نے ایک نہایت ہی اہم سوال کیا۔

''میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا جناب۔'' وہ ہچکچاہٹ آمیز انداز میں بولا۔ ''ہوسکتا ہے، آجائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ تانگا کھڑا کر کے اپنے گھر چلا جائے۔''

کرامت علی کی بات میں وزن تھا۔ میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے چاچا! آج کا دن تم سرکار کی ڈیوٹی پر ہو۔ تمہیں ابھی میرے ساتھ چھچھر والی جانا ہوگا۔ پہلے ہم یہاں سے تھانے چلیں گے۔ وہاں سے میں کسی کو اپنے ساتھ لوں گا۔ پھر ہم چھچھر والی کی جانب روانہ ہوجائیں گے۔''

کرامت علی کے پاس انکار کی گنجائش نہیں تھی۔ چند لمحات تک تذبذب میں رہنے کے بعد وہ رضامندانہ لہجے میں بولا۔ ''ٹھیک ہے سرکار۔ جو آپ کا حکم......''

میں نے اس کے اطمینان کی غرض سے وضاحت کردی۔ ''چاچا! یہ نہ سمجھنا کہ کارِ سرکار میں تمہارا کسی قسم کا مالی نقصان ہوجائے گا۔ میں ان پولیس والوں میں سے نہیں ہوں جو شہریوں کی جیب سے کچھ نہ کچھ نکلوانے کے چکر میں رہتے ہیں۔ تم ایک دن میں جتنا کما لیتے ہو، میں وہ رقم تمہیں اپنی جیب خاص میں سے دوں گا۔ تم ہمیں چھچھر والی غلام عباس کے پاس پہنچاؤ گے اور اگر وہ ہمیں راستے میں کہیں مل گیا تو اسی وقت تمہاری چھٹی۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''جی سمجھ گیا۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

تھوڑی ہی دیر میں ہم تھانے پہنچ گئے۔ کرامت علی نے یہ سفر اپنے تانگے میں اور میں نے اپنے گھوڑے پر طے کیا تھا۔ کرامت علی کو میں نے اس لیے اپنے ساتھ جوڑ لیا تھا کہ یہ موقع کا گواہ تھا۔ اس نے میری مطلوبہ عورتوں کو غلام عباس کے تانگے میں بیٹھ کر چھچھر والی جاتے دیکھا تھا لہٰذا غلام عباس، کرامت علی کی گواہی کو رد نہیں کرسکتا تھا۔ بڑی مشکل سے تو اس کیس کا ایک سرا میرے ہاتھ لگا تھا۔ میں اس موقع کو ہر صورت کیش کرنا چاہتا تھا ورنہ چھچھر والی گاؤں میرے لیے نیا نہیں تھا اور نہ ہی میں وہاں تک رسائی کے راستے سے ناآشنا تھا۔

میں نے تھانے سے اے ایس آئی یعقوب کو ساتھ لیا پھر ہم دونوں کرامت علی کے تانگے میں بیٹھ کر چھچھر والی کی جانب روانہ ہوگئے۔

☆☆☆

چھچھر والی بھی ایک چھوٹا سا گاؤں تھا تاہم اس کا ''سائز'' فرید پور سے زیادہ تھا۔ یہ رقبے اور آبادی کے لحاظ سے نسبتاً ایک درمیانے درجے کا گاؤں تھا۔ کوچوان غلام عباس کا گھر تلاش کرنے میں ہمیں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ کرامت علی کا اندازہ درست تھا۔ غلام عباس نے گاؤں پہنچ کر اپنا تانگا کھڑا کردیا تھا۔ اب اس کا مزید دھندا کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔

ایک تو پولیس کا نام ہی کافی ہوتا ہے، اوپر سے پولیس والے اگر یونیفارم میں ہوں تو ہر بند در خود بخود کھلنے لگتا ہے۔ غلام عباس نے ہمیں لے جا کر یاسمین آنٹی کے گھر کے سامنے کھڑا کردیا۔

جی...... یاسمین اسی کیم شحیم عورت کا نام تھا جسے غلام عباس نے چودہ دسمبر کی دوپہر ریلوے اسٹیشن سے چھچھر والی پہنچایا تھا۔ غلام عباس کے مطابق یاسمین آنٹی کا تعلق چھچھر والی ہی سے تھا تاہم اس روز یاسمین کے ساتھ جو گوری چٹی جوان لڑکی تھی وہ غلام عباس کے لیے نئی تھی۔ غلام عباس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ یاسمین ایک فیشنی عورت ہے اور وہ خود کو آنٹی کہلاتی ہے۔ اگر اسے کوئی چاچی یا ماسی کہہ دے تو وہ برا مان جاتی ہے۔

میں نے غلام عباس کا شکریہ ادا کر کے اسے فارغ کردیا اور خود یاسمین آنٹی کے دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ گھر کے سامنے والے حصے میں مجھے ایک دکان نظر آئی جہاں پر ایک گنجا شخص بیٹھا پھل اور سبزی بیچ رہا تھا۔ گھر کا دروازہ اس دکان کے ساتھ ہی تھا۔ ہمیں اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر گنجا شخص اپنی دکان سے باہر نکل آیا تھا۔ میں اس کے نزدیک پہنچا تو اس نے اپنی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر مجھے اور اے ایس آئی کو سلام کیا۔ میں نے اس کے سلام کا جواب دینے کے بعد گھر کے دروازے کی سمت انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''کیا آنٹی یاسمین ادھر ہی رہتی ہے؟''

''جی...... جی۔'' وہ بڑی سرعت سے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''میرا نام سردار حسین ہے۔ میں یاسمین کا گھر والا ہوں۔''

وہ جتنی مسکینیت سے اپنا تعارف کرا رہا تھا اس سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اپنی بیوی کے دباؤ میں ہے۔ میں نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔

''سردار! تم آنٹی یاسمین کے گھر والے ہو تو اسے گھر سے باہر لے کر آؤ یا ہمیں اپنے گھر کے اندر کہیں بٹھاؤ۔ مجھے تمہاری بیوی سے بہت ضروری باتیں کرنا ہیں۔''

"سب خیریت تو ہے نا جی۔" وہ تشویش ناک انداز میں ہم دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "گڑبڑ والی کوئی بات تو نہیں......؟"

"اوئے نامعقولا......" اے ایس آئی نے تیز نظروں سے اسے گھورا۔ "پولیس خوامخواہ ہی کسی کے دروازے پر نہیں آتی۔ تم اپنی بیوی کو باہر نکالتے ہو یا ہم دروازہ توڑ کر تمہارے گھر کے اندر داخل ہو جائیں؟"

"لگتا ہے، اس کمینی نے پھر کوئی گڑبڑ کر دی ہے۔" سردار حسین نے بے حد پریشانی کے عالم میں خود کلامی کی۔

"میرا نام ملک صفدر حیات ہے۔" میں نے سردار کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں اس علاقے کا تھانے دار ہوں اور یہ میرے ساتھ اے ایس آئی یعقوب ہے۔" میں نے اپنے نائب کی جانب اشارہ کیا اور پوچھا۔ "کیا تمہاری بیوی پہلے بھی گڑبڑ کرتی رہی ہے جو تم اس قدر گھبرائے ہوئے نظر آرہے ہو؟"

"بس جی، وہ ایسی ہی ہے۔" اس نے گول مول جواب دیا۔

اسی لمحے گھر کے اندر سے ایک کرخت نسوانی آواز بلند ہوئی۔ اس آواز نے سردار حسین کو سہا دیا۔ وہ سردار ہی سے استفسار کر رہی تھی۔

"اے سردار! تم کس سے باتیں کر رہے ہو۔ کیا دکان داری میں تمہارا دل نہیں لگتا؟"

"یہ تمہاری بیوی ہی ہے نا۔" میں نے سوالیہ نظر سے سردار حسین کی طرف دیکھا۔ "آنٹی یاسمین......؟"

"جی، ہاں۔ وہی ہے۔" وہ جلدی سے بولا پھر قدرے جرأت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔ "خود ہی باہر آکر دیکھ لو کہ تم سے کون ملنے آیا ہے۔"

"مجھ سے ملنے......!" آنٹی یاسمین کی آواز میں حیرت شامل ہوگئی۔ "یہ تم کیا بکواس کر رہے ہو......؟"

مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ آنٹی یاسمین ایک غصہ ور اور بدتمیز عورت تھی جس کی نظر میں شوہر کی حیثیت کسی زرخرید غلام سے زیادہ نہیں تھی۔

قبل اس کے کہ سردار حسین اس کے استفسار کے جواب میں گھگیا کر کچھ کہتا، ایک جھٹکے سے گھر کا دروازہ کھل گیا۔ میں نے کھلے ہوئے دروازے میں جس عورت کو کھڑے دیکھا، اس کی عمر پینتالیس کے قریب رہی ہوگی۔ وہ گندمی رنگت کی مالک ایک پستہ قامت اور موٹی عورت تھی۔ وہ نصیر علی کے بنائے ہوئے خاکے پر پوری اترتی تھی۔ یہی میری مطلوبہ عورت تھی۔ یاسمین نے بھڑک دار لباس پہن رکھا تھا۔ اس کے بال سلیقے سے گندھے ہوئے تھے اور آنکھوں میں کاجل کی دھار بھی کافی نمایاں تھی۔ وہ اپنے چہرے مہرے سے ایک کرخت اور خرانٹ عورت دکھائی دیتی تھی، زود طیش اور پلک جھپکتے میں غصے میں آجانے والی لیکن پولیس پر نظر پڑتے ہی وہ یکایک حواس باختہ ہوگئی تھی۔

یاسمین نے میکانکی انداز میں دروازے کو بند کرنا چاہا لیکن میں غافل نہیں تھا۔ میں نے دروازے کے دونوں پٹ کے درمیان اپنا پاؤں پھنسا کر اس کی کوشش کو ناکام بنا دیا۔ اس کے باوجود بھی وہ زور لگا کر میرے بوٹ کو کچلنے کی سعی میں مصروف رہی۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"تمہارا کھیل ختم ہوگیا آنٹی یاسمین۔ اب تمہارے حق میں یہی بہتر ہے کہ جو میں پوچھوں اس کا ٹھیک ٹھیک جواب دو، ورنہ میں تمہیں گرفتار کر کے اپنے ساتھ تھانے لے جاؤں گا پھر وہاں حوالات میں بیٹھ کر تم آہنی زیور کے ساتھ زور آزمائی کرتی رہنا۔"

میری دھمکی کافی کارگر ثابت ہوئی۔ دروازے پر اس نے طبع آزمائی کو موقوف کر دیا۔ میرے لہجے کی خطرناکی نے اسے باور کرا دیا تھا کہ یہاں دھونس دھاندلی کے مسالے سے اس کی دال نہیں گلنے والی۔ وہ خاصی سرد و گرم چشیدہ عورت دکھائی دیتی تھی۔ بیک فٹ پر جاتے ہوئے اس نے مجھ سے پوچھا۔

"آپ کس سلسلے میں یہاں آئے ہیں؟"

"سلسلہ بھی بتا دوں گا۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے تیکھے لہجے میں کہا۔ "اگر دروازے پر کھڑے کھڑے میں نے تم سے پوچھ تاچھ شروع کر دی تو پورے محلے والی کو تمہارے کرتوتوں کا پتا چل جائے گا۔ کیا تمہارے گھر کے اندر بیٹھنے کی کوئی جگہ نہیں ہے؟"

"آخر میرا قصور کیا ہے؟" اس نے نیم احتجاجی لہجے میں پوچھا اور گھر کا دروازہ کھول دیا۔

میں سردار حسین کی راہنمائی میں اے ایس آئی کے ہمراہ گھر کے اندرونی حصے میں پہنچ گیا۔ ہم صحن میں بچھی چارپائیوں پر بیٹھنے لگے تو یاسمین آنٹی نے اپنے شوہر سے کہا۔

"تمہاری یہاں پر کوئی ضرورت نہیں۔ تم باہر جا کر

دکان کو سنبھالو۔''

سردار حسین اتنا زیادہ بیوی کے رعب میں تھا کہ اس کے حکم کی بجا آوری کے لیے فوراً مڑ گیا۔ میں نے آواز دے کر اسے روک لیا۔

''سردار! تم بھی ادھر ہی بیٹھو۔ مجھے تم سے بھی بہت کچھ پوچھنا ہے۔''

اس نے رک کر سوالیہ نظر سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا جیسے اجازت طلب کر رہا ہو۔ میں نے ڈانٹ آمیز انداز میں کہا۔

''ادھر کیا دیکھ رہے ہو۔ اس علاقے کا تھانے دار میں ہوں یا تمہاری بیوی؟''

''تھانے دار تو اس علاقے کے آپ ہی ہیں مائی باپ۔'' وہ منت ریز لہجے میں بولا پھر یاسمین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اضافہ کیا۔ ''اور گھر کی تھانے دارنی یہ ہے۔''

''فی الحال تم گھر کی تھانے دارنی کو بھول جاؤ کیونکہ اس وقت وہ خود بھی علاقے کے تھانے دار کے سامنے لائن حاضر ہے۔'' میں نے اس کے کانوں کے کیڑے جھاڑتے ہوئے کہا۔ ''ادھر وہی ہوگا جو میں چاہوں گا۔''

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے میرے اشارے پر اپنی بیوی کے پہلو میں چارپائی پر بیٹھ گیا۔ ان کے سامنے دوسری چارپائی پر میں نے اور اے ایس آئی نے قبضہ جما لیا۔ میں نے سردار اور یاسمین کو پہلو بہ پہلو اس لیے بٹھایا تھا تاکہ اگر یاسمین، سردار کو کوئی اشارہ کرے تو وہ میری پکڑ میں آجائے۔

یاسمین نے ایک مرتبہ پھر قدرے خفگی آمیز انداز میں پوچھا۔ ''یہ سب ہو کیا رہا ہے؟ آخر آپ مجھ سے چاہتے کیا ہیں......؟''

''چند سوالوں کے سیدھے اور کھرے جواب۔'' میں نے یاسمین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ''اگر تم نے تعاون کیا تو میں چپ چاپ واپس چلا جاؤں گا۔ بصورتِ دیگر تمہیں بھی میرے ساتھ تھانے جانا ہوگا۔''

میرے حتمی انداز نے اسے مشکل میں ڈال دیا۔ چند لمحات تک تذبذب کا شکار رہنے کے بعد وہ تھوک نگلتے ہوئے بولی۔ ''پوچھیں کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''وہ لڑکی کہاں ہے؟''

میں نے اس بے ساختگی کے ساتھ یہ سوال کیا تھا کہ اسے سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہیں مل سکا۔ غیر ارادی طور پر اس نے الٹا مجھ سے استفسار کیا۔

''کون سی لڑکی؟''

''میں اس لڑکی کے بارے میں پوچھ رہا ہوں......'' میں نے اپنے لہجے کی کرختگی کو برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ ''جو چار روز پہلے ریلوے اسٹیشن سے تمہارے ساتھ ایک تانگے پر سوار ہو کر پھیر والی پہنچی تھی۔ کچھ یاد آیا یا میں اس لڑکی کا فوٹو بھی دکھاؤں؟''

''فوٹو......؟'' اس نے الجھن زدہ نظر سے میری طرف دیکھا۔

میں نے نصیر علی کے تیار کردہ اسکیچ کو آنٹی یاسمین کے سامنے رکھا پھر اس خاکے میں موجود لڑکی پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ لڑکی!''

آنٹی یاسمین ایک اچھی اداکارہ بھی تھی۔ اپنے اور اس لڑکی کے اسکیچ کو دیکھ کر اس کے چہرے پر اطمینان بھرے تاثرات نمودار ہوئے پھر وہ سنبھلے ہوئے لہجے میں بولی۔

''اچھا تو آپ فرزانہ کی بات کر رہے ہیں......''

مجھے شک ہوا کہ وہ مجھے چکر دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے سردار حسین کے چہرے پر نگاہ ڈالی تو وہاں مجھے تذبذب کی پرچھائیں دکھائی دی جس کا مطلب یہی تھا کہ وہ اپنی بیوی کے جواب سے اتفاق نہیں کرتا۔

''اچھا تو اس لڑکی کا نام فرزانہ ہے۔'' میں نے یاسمین ہی کے انداز میں اسے گھسنا شروع کیا اور پوچھا۔ ''تمہارا فرزانہ کے ساتھ کیا تعلق ہے؟''

''تھانے دار صاحب! فرزانہ میری بھانجی ہے، بہن خورشید کی بیٹی۔'' وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے خاصے مضبوط لہجے میں بولی۔ ''یہ لوگ ادھر لالہ موسیٰ میں رہتے ہیں۔ فرزانہ مجھ سے ملنے آئی تھی اس لیے میں اسے لینے ریلوے اسٹیشن گئی تھی۔''

یاسمین نے برمحل جواب دیا تھا لیکن پچھلے دو تین روز سے میں حالات کی جن گھمن گھیریوں میں الجھا ہوا تھا اس کی روشنی میں، میں آنکھیں بند کر کے یاسمین کی بات پر بھروسا نہیں کر سکتا تھا لہٰذا میں نے تصدیق طلب انداز میں سردار حسین کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

''سردار! تمہاری شادی کو کتنا عرصہ ہوا ہے؟''

''کوئی پندرہ بیس سال تو ہو ہی گئے ہیں سرکار۔'' وہ جزبز ہوتے ہوئے بولا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ میں نے اس سے یہ سوال کیوں کیا تھا۔ یاسمین آنٹی نے ایک بار پھر سردار کو

وہاں سے ہٹانے کی کوشش کی۔ اس سے پہلے کہ سردار میری بات کا جواب دیتا، وہ بیزاری سے بولی۔
''تم کیا سارا دن ادھر ہی بیٹھے رہو گے؟ جاؤ، باہر جا کر دکان داری کو دیکھو۔''
مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ یاسمین دانستہ سردار کو وہاں سے بھگانا چاہتی ہے جیسے اسے ڈر ہو کہ اس کی کوئی بات یاسمین کے بیان کی تردید کر دے گی۔ میں نے سردار کو وہیں بیٹھے رہنے کی تاکید کی اور کہا۔
''تم ان پندرہ بیس سال میں کتنی مرتبہ اپنی سالی خورشید کے پاس لالہ موسیٰ گئے ہو؟''
''یہ تو کہیں نہیں جاتا تھانے دار صاحب۔'' یاسمین جلدی سے بولی۔ ''بس ادھر ہی دکانداری میں کھپتا رہتا ہے۔''
''میں نے تم سے نہیں، سردار سے سوال کیا تھا۔'' میں نے یاسمین کی طرف دیکھتے ہوئے غصیلے انداز میں کہا۔ ''اور جب تک میں تم سے کچھ نہیں پوچھوں، تم اپنی چونچ کو بند ہی رکھو......'' پھر میں دوبارہ اس کے شوہر کی جانب متوجہ ہو گیا۔
''ہاں سردار...... یہ خورشید اور فرزانہ کے کردار ابھی ابھی تخلیق کیے گئے ہیں یا تم پہلے سے انہیں جانتے ہو؟''
''یہ تو آپ...... یاسمین ہی سے...... پوچھیں......'' وہ بے حد الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں بھلا کیا کہہ سکتا ہوں۔''
''ٹھیک ہے۔ اگر بیوی کے سامنے تمہاری زبان نہیں کھل رہی تو اب میں تھانے لے جا کر ہی تم سے بات کروں گا۔'' میں نے سردار سے کہا پھر روئے سخن یاسمین کی جانب موڑتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔
''تو کہاں ہے وہ تمہاری بھانجی فرزانہ؟''
''وہ تو واپس لالہ موسیٰ چلی گئی ہے جی۔'' وہ بڑی ہوشیاری سے بولی۔
وہ صد فیصد دروغ گوئی سے کام لے رہی تھی اور جھوٹے کو اس کے گھر تک چھوڑ کر آنا ہمیشہ سے میری عادت رہی ہے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔
''خیر سے اس کی واپسی کب ہوئی ہے؟''
''وہ آج صبح ہی تو گئی ہے۔'' وہ جلدی سے بولی۔
''اچھا اچھا...... تم غلام عباس کے تانگے میں اپنی بھانجی کو اسٹیشن چھوڑنے گئی تھیں نا؟'' میں نے تیز نظر سے اسے گھورا۔
''جی...... بالکل......'' وہ مکاری سے بولی۔ ''آپ کو کس نے بتایا کہ ہم غلام عباس کے تانگے میں گئے تھے؟''
''غلام عباس نے۔'' میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں ابھی تھوڑی دیر پہلے اس سے مل کر آیا ہوں۔''
وہ سمجھ گئی کہ میں اسے گھیرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اس کے دل میں چور تھا اس لیے اس کے چہرے پر ایسے تاثرات نمودار ہوئے جیسے اسے اپنے جھوٹ کے پکڑے جانے کا اندیشہ ہو۔ ایسا خدشہ عموماً اس وقت پیدا ہوتا ہے جب انسان نے صریحاً دروغ گوئی سے کام لیا ہو۔ ان لمحات میں یاسمین کی کچھ ایسی ہی حالت تھی۔
''کیا آپ نے واقعی غلام عباس سے ملاقات کی ہے؟'' وہ شک زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔
''ہاں، ہاں۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''کیا مجھے اس کوچوان سے نہیں ملنا چاہیے تھا؟''
''میں نے ایسا کب کہا تھانے دار صاحب۔'' وہ بات بناتے ہوئے بولی۔ ''آپ اس علاقے کے تھانے دار ہیں۔ آپ جس سے بھی ملیں، آپ کو بھلا کون روک سکتا ہے۔''
''فی الحال تو میں تم سے ملنے آیا ہوں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن لگتا ہے، شرافت کی زبان تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہی اس لیے تمہیں تھانے ہی لے جانا پڑے گا۔''
''جناب! میں آپ کے ہر سوال کا جواب دے تو رہی ہوں۔'' وہ بیزاری سے بولی۔ ''آپ خوامخواہ ہی مجھ سے ناراض ہو رہے ہیں......''
''او آنٹی! میں خوامخواہ کچھ بھی نہیں کرتا ہوں۔'' میں نے اس کی غلط فہمی دور کرتے ہوئے کہا۔ ''میں اتنی دیر سے تمہاری بک بک سن رہا ہوں اور تمہیں جھوٹ پر جھوٹ بولنے سے ہی فرصت نہیں ہے۔ تمہارے اندر شرم نام کی بھی کوئی چیز ہے یا نہیں؟''
وہ کمال ڈھٹائی سے بولی۔ ''میں نے کون سا جھوٹ بولا ہے جی؟''
مجھے اس پر بہت غصہ آیا۔ اگر وہ عورت ذات نہ ہوتی تو میں لاتوں گھونسوں سے اس کی وہ درگت بناتا کہ سالوں تک اسے میرا یہ سلوک یاد رہتا۔ میں نے اپنے غصے کو قابو میں رکھتے ہوئے کہا۔
''تم نے کوئی ایک جھوٹ بولا ہو تو میں بتاؤں بھی۔ تم جس لڑکی کو اپنی بھانجی بتا رہی ہو اس کا تم سے کوئی رشتہ نہیں۔ اگر وہ تمہاری بھانجی ہوتی تو تم اسے قادو کے حوالے کبھی نہ کرتیں۔ تمہیں کچھ اندازہ نہیں کہ ادھر فرید پور میں

کون سی قیامت برپا ہو چکی ہے۔ تم جس لڑکی کو بہلا پھسلا کر یہاں لائی تھیں اور پھر دو روز کے بعد اسے قادو کے سپرد کر دیا، وہ تمہاری بھانجی کیسے ہو سکتی ہے؟''

''میں تو کسی قادو کو نہیں جانتی......''

''بکواس بند کرو۔'' اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی میں نے گرجدار آواز میں کہا۔ ''اس بات کا مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ تم بہت ہی ڈھیٹ مٹی سے بنی ہوئی ہو لہٰذا تمہارے ساتھ سارے سوال و جواب اب تھانے ہی میں ہوں گے۔ وہاں پہنچ کر تمہاری زبان کے تمام قفل خود ہی کھل جائیں گے۔ ایک منٹ میں فیصلہ کر لو کہ شرافت سے میرے ساتھ چلتی ہو یا پورے چھچھر والی کے دسنیکوں کے سامنے تمہیں گھسیٹتے ہوئے میں تھانے لے جاؤں؟''

وہ چپ چاپ میرے ساتھ تھانے جانے کے لیے رضامند ہو گئی۔

میں نے اس کے نام نہاد گھر والے کو اس کے گھر ہی میں چھوڑا اور آنٹی یاسمین کو کرامت علی کے تانگے میں بٹھا کر چھچھر والی سے تھانہ صدر لے آیا۔ جب ہم تھانے پہنچے تو سورج کے غروب ہونے میں چند منٹ باقی تھے۔ میں نے کرامت علی کو اس کی اوسط دہاڑی سے کچھ زیادہ رقم دے کر رخصت کر دیا اور یاسمین کو حولدار نبی بخش کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

''یہ آنٹی یاسمین ہے جس نے وہ لڑکی چودھری رستم کے ڈیرے پر پہنچائی تھی۔ یاسمین بے چاری گونگی ہے لیکن میں اس کی زبان سے سچ سننا چاہتا ہوں۔ آج کی رات کے لیے میں اسے تمہارے سپرد کر رہا ہوں۔ سنا ہے، تمہارے پاس زبان کھلوانے کا کوئی منتر ہے۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟''

''اچھی طرح سمجھ رہا ہوں ملک صاحب۔'' وہ اپنے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولا۔ ''آپ بے فکر ہو کر اپنے کوارٹر پر جائیں۔ صبح جب آپ اپنے کمرے میں پہنچیں گے تو آنٹی یاسمین کی زبان کا آپریشن کر کے میں اسے بولنے، خصوصاً سچ بولنے کے قابل بنا چکا ہوں گا۔''

میں بے فکر ہو کر اپنے کوارٹر کی طرف چلا گیا۔

☆☆☆

اس امر میں کسی شک و شبہے کی گنجائش تلاش نہیں کی جا سکتی تھی کہ آنٹی یاسمین نے مجھ سے متعدد جھوٹ بولے تھے۔ جب انسان کسی معاملے میں دروغ گوئی کا سہارا لیتا ہے تو اس کے پیشِ نظر کوئی خاص مقصد ہوتا ہے۔ نفسیات داں کسی جھوٹ کے پیچھے چھپے ہوئے مقصد کی چار وجوہات بتاتے ہیں اور ان چاروں وجوہ کا تعلق انسان کے فائدے اور نقصان سے ہے۔ اول، انسان کوئی بہت بڑا فائدہ حاصل کرنے کے لیے دروغ سے کام لیتا ہے۔ دوم، وہ کسی بڑے نقصان سے بچنے کے لیے غلط بیانی کا سہارا لیتا ہے۔ سوم، وہ اپنی جھوٹی شان دکھانے یعنی خود کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کے لیے دروغ گوئی کرتا ہے اور چہارم، وہ اپنی کسی کجی کو چھپانے یا کسی جرم کی پردہ پوشی کی غرض سے جھوٹ بولتا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ آنٹی یاسمین کے جھوٹ میں یہ چاروں وجوہات درجہ بہ درجہ موجود تھیں۔

اگلی صبح میں تیار ہو کر اپنے کمرے میں پہنچا تو حوالدار نبی بخش نے میرے پاس آ کر خوشخبری سنا دی۔ پُرمسرت لہجے میں اس نے مجھے بتایا۔

''ملک صاحب! آنٹی کے سارے کس بل میں نے نکال دیے ہیں۔ وہ اپنی تن فن بھول چکی ہے۔ میں نے اس کی زبان سے نہایت ہی سنگین انکشافات کروا لیے ہیں۔ آپ بھی اس کا باقاعدہ بیان ریکارڈ کر لیں۔''

اس زمانے میں محکمۂ پولیس کے پاس آڈیو یا وڈیو ریکارڈنگ کی کوئی سہولت موجود نہیں ہوتی تھی۔ یہاں پر ''بیان ریکارڈ'' کرنے سے مراد تحریری بیان نوٹ کرنے کے بعد اس پر ملزم یا مجرم کے دستخط یا انگوٹھے کا نشان لینا ہے۔

''تم نے اسے جسمانی تشدد سے تو نہیں گزارا؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''نہیں ملک صاحب!'' نبی بخش ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں خواتین پر تشدد کو ٹھیک نہیں سمجھتا۔''

''پھر تم نے آنٹی یاسمین پر ایسا کون سا جادو کیا ہے کہ وہ زبان کھولنے پر مجبور ہو گئی؟'' میں نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔

''ملک صاحب! میں نے آنٹی کے پانی میں پیشاب آور دوائی ملا دی تھی۔'' وہ ایک آنکھ دبا کر وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اور اس کے ساتھ ہی میں نے آنٹی کے باتھ روم جانے پر پابندی عائد کر دی تھی۔ رات کے کھانے کے ساتھ اس نے اچھا خاصا پانی پی لیا تھا، اوپر سے موسم بھی ٹھنڈا ٹھار ہے۔ آنٹی سے برداشت نہیں ہو سکا اور جب اس نے محسوس کیا کہ اگر وہ رفع حاجت کے لیے باتھ روم نہیں گئی تو اس کا مثانہ پھٹ جائے گا، تب اس نے ہتھیار پھینک دیے اور سچ بولنے کے لیے

آمادہ ہوگئی۔ بس، اتنی سی بات ہے۔"
"تمہاری نظر میں یہ اتنی سی بات ہوگی نبی بخش۔" میں نے ستائشی انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ "لیکن میری نگاہ میں تم ایک جلاد صفت ماہر نفسیات ہو۔"
"ملک صاحب! میں آپ کے الفاظ کو اپنی تعریف سمجھوں یا......؟" اس نے بات نامکمل چھوڑی اور سوالیہ انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔
"اپنے بارے میں تم بعد میں غور وفکر کرتے رہنا۔" میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے سرسری انداز میں کہا۔ "فی الحال تم آنٹی یاسمین کو یہاں لے کر آؤ تاکہ میں اس کا بیان ریکارڈ کرسکوں۔"
"ہنے گیا تے ہنے آیا ملک صاحب۔" وہ باچھیں پھیلاتے ہوئے بولا۔ پھر کھٹاک کی آواز کے ساتھ مجھے سیلوٹ مار کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔
یہ سچ ہے کہ بعض اوقات خطرناک مجرموں کی زبان کھلوانے کے لیے انہیں انسانیت سوز سلوک سے بھی گزارنا پڑتا ہے اور کبھی کبھار بدقسمتی سے کوئی بے گناہ بھی اس رگڑے میں آجاتا ہے۔ بہرحال، یہ سب ہماری مجبوری ہوتی ہے۔ آپ اسے تفتیش کا ایک حصہ سمجھ لیں تاہم عورتوں کو جسمانی نہیں بلکہ نفسیاتی اور بعض اوقات ذہنی دباؤ میں لاکر ان کی زبان کا تالا کھلوایا جاتا ہے جیسا کہ نبی بخش نے آنٹی یاسمین کے ساتھ کیا تھا۔
آنٹی یاسمین ایک گھیرو (گھیرنے والی) عورت تھی۔ وہ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں اور ایک شہر سے دوسرے شہر سفر کرتی رہتی تھی۔ وہ بہت شاطر اور کائیاں تھی۔ اسے جہاں بھی کوئی بے آسرا یا پریشان لڑکی نظر آتی۔ وہ اسے اپنی ہمدردی اور محبت کا جھانسا دے کر اپنے ساتھ چھچھر والی لے آتی تھی۔ بعدازاں وہ اسے فریب میں رکھ کر آگے بڑھا دیتی تھی اور پیسے کھرے کرلیتی تھی۔ قادو اور اسی قماش کے چند افراد سے اس کی اچھی جان پہچان تھی۔ وہ موقع محل کی مناسبت سے ورغلا کر لائی ہوئی لڑکی کو کہیں نہ کہیں کھپا دیا کرتی تھی۔ ماہ جبیں کو یاسمین نے قادو کے حوالے کیا تھا۔ قادو پہلے بھی اس سے رستم کے لیے کئی بار اس نوعیت کا معاملہ کرچکا تھا۔
ماہ جبیں، آنٹی یاسمین کو گوجرانوالہ کے ریلوے اسٹیشن پر ملی تھی۔ وہ پہلی ہی نظر میں پہچان گئی تھی کہ یہ اس کا شکار ہے۔ وہ ماہ جبیں کے نزدیک ہی بینچ پر بیٹھ گئی۔ آئندہ دس منٹ کے اندر وہ اپنے پیار بھرے انداز سے ماہ جبیں کی حقیقت سے آگاہ ہوچکی تھی۔ وہ ماہ جبیں کا اعتماد حاصل کرنے کے بعد بہلا پھسلا کر اسے اسٹیشن سے چھچھر والی لے آئی تھی۔ یاسمین کا شوہر سردار حسین اس کی غیرنصابی سرگرمیوں سے آگاہ تھا تاہم وہ ایک زن مرید قسم کا شوہر تھا۔ یاسمین کے سامنے اس کی کوئی پیش نہیں چلتی تھی۔
یاسمین آنٹی نے مجھے بتایا۔ "ماہ جبیں کا تعلق وزیرآباد کی سبزی منڈی کے علاقے سے ہے۔"
میں نے یاسمین کو فرید پور کے حالات سے اچھی طرح آگاہ کردیا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ وہاں قادو اور رستم کو بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔
"ماہ جبیں نے اپنا گھر کیوں چھوڑا تھا؟"
"اس کی ماں نے دوسری شادی کرلی تھی۔" اس نے بتایا۔ "سوتیلا باپ اس پر بری نیت رکھتا تھا اور گاہے بہ گاہے اسے تنگ بھی کرتا رہتا تھا۔ ماہ جبیں نے اپنی ماں سے شکایت کی لیکن اس نے ماہ جبیں کی بات کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیا۔ جب اس کے پاس کوئی چارۂ کار نہ رہا تو اس نے گھر کو چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا۔"
"تم دنیا کی کمینی ترین عورت ہو۔" میں نے نفرت بھری نظر سے یاسمین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "جس عزت کی حفاظت کے لیے ماہ جبیں نے اپنا گھر چھوڑا تھا تم نے جھوٹی محبت کا فریب دے کر ماہ جبیں کی اسی عزت کو نیلام کرنے کی کوشش کی۔"
وہ بڑی ادا سے بولی۔ "آپ ناراض تو نہ ہوں تھانے دار صاحب۔ میں نے آپ کی بات مان کر سب کچھ سچ بتادیا ہے۔"
"یہ ادائیں اور چھل کسی اور کو دکھانا۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "میں تمہارے دام فریب میں آنے والا نہیں ہوں اور جہاں تک سچ اگلوانے کا معاملہ ہے نا......" لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔
"تمہارے جیسے گھناؤنے کردار کی مالک عورتوں کی زبان کھلوانے کے لیے میں ان کے پانچوں میں چوہے چھوڑ کر پانچوں کا منہ بند بھی کرواسکتا ہوں۔"
ان لمحات میں مجھے اپنے غصے پر کافی حد تک قابو نہیں رہا تھا۔ وہ میری کیفیت کو دیکھتے ہوئے بولی۔
"تھانے دار صاحب! غصہ تھوک دیں۔ جو ہونا تھا وہ تو ہوگیا۔ یہ لڑکی اتنی منحوس ثابت ہورہی ہے کہ اس کی وجہ

سے دو انسان اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں اور میں بھی اسی کے طفیل بیٹھے بٹھائے مصیبت میں پھنس گئی ہوں۔"

"تم نے صرف مصیبت کا نام سنا ہے آنٹی یاسمین۔" میں نے زہرخند لہجے میں کہا۔ "کبھی تم پر مصیبت آئی نہیں ہوگی۔ میں تمہارا جو حشر نشر کرنے والا ہوں نا، اسے تم تاحیات یاد رکھوگی۔"

"آپ مجھے ڈرائیں تو نہیں تھانے دار صاحب۔" وہ بڑی لگاوٹ سے بولی۔ "جس لڑکی کی وجہ سے آپ مجھے ڈانٹ رہے ہیں وہ اس وقت پتا نہیں، کہاں عیشِ بہار کرتی پھر رہی ہوگی۔"

میں نفرت بھرے انداز میں یک ٹک اسے دیکھتا چلا گیا۔

"آپ مجھے ایسے کیوں گھور رہے ہیں؟" اس نے اپنایت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"میں یہ اندازہ لگانے کی کوشش کررہا ہوں کہ تم کس بے حیا اور بے عزت مٹی سے بنی ہو۔" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "تمہیں عورت کہتے ہوئے مجھے شرم محسوس ہورہی ہے۔"

وہ بڑی گہری نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ اس کی دعوتی اداؤں نے مجھ پر کوئی اثر نہیں کیا تھا۔ شاید وہ سوچ رہی تھی کہ اب مجھ پر کون سا داؤ آزمائے۔ میں نے سخت لہجے میں کہا۔

"جو ہونا تھا وہ تو ہوچکا لیکن بہت کچھ ہونا ابھی باقی ہے۔ جس لڑکی کو تم منحوس کہہ رہی ہو وہ میری نظر میں مظلوم ہے۔ تم اپنے کالے کرتوتوں کے سبب میری گرفت میں آئی ہو۔ میں ہر حال میں ماہ جبیں کو تلاش کروں گا تاکہ دہرے قتل کے معاملے سے پردہ اٹھ سکے۔"

"آپ ضرور تحقیق اور تفتیش جاری رکھیں تھانے دار صاحب۔" وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ "قادو اور چودھری رستم کے قتل سے میرا کوئی تعلق واسطہ نہیں۔ اس لیے مجھے تو اپنے گھر جانے کی اجازت دیں۔"

"تم یہاں سے سیدھی بڑے گھر جاؤ گی آنٹی یاسمین۔" میں نے بے حد کڑوے انداز میں کہا۔ "سال، دو سال جیل میں چکی پیسو گی تو خود ہی تمہارے ہوش ٹھکانے آجائیں گے اور یہ نہیں سمجھنا کہ قادو اور چودھری رستم کے قتل سے تمہارا کوئی واسطہ نہیں۔ اگر ماہ جبیں نہیں ملی تو میں تمہیں بھی نہیں چھوڑوں گا اس لیے دعا کرو کہ ماہ جبیں کا جلد از جلد سراغ مل جائے اور یہ ثابت ہو کہ تم ان دونوں کے قتل میں ملوث نہیں ہو۔"

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ پہلی مرتبہ وہ مجھے سراسیمہ نظر آئی۔ اسے بخوبی اندازہ ہوگیا تھا کہ میں آسانی سے اس کی جان چھوڑنے والا نہیں ہوں۔

"وہ دو دن تک تمہارے گھر میں رہی۔" میں نے ایک اہم سوال کیا۔ "پھر کیا بتا کر اسے تم فرید پور والے ڈیرے پر لے گئی تھیں؟"

"قادو کے حوالے سے میں نے ماہ جبیں کو بتایا تھا کہ وہ میرا بھائی ہے۔" وہ بڑی عیاری سے بولی۔ "وہ گوجرانوالہ کے اسٹیشن پر اس لیے اتر گئی تھی کہ اسے شک ہوا تھا، کوئی اس کا تعاقب کررہا ہے۔ لوگوں کو اس نے یہی بتایا تھا کہ اسے جانا تو آگے تھا لیکن وہ غلطی سے اس اسٹیشن پر اتر گئی مگر حقیقت وہی ہے جو میں نے آپ کو بتائی۔ میں نے اس کے اسی وہم کو استعمال کیا کہ وزیرآباد سے کوئی اس کا پیچھا کررہا ہے۔ میں ایک دن پہلے ہی قادو سے بات پکی کرآئی تھی۔ میں نے ماہ جبیں کو اپنے گھر سے فرید پور والے ڈیرے پر منتقل کرنے کے لیے ایک چال چلی۔ میں نے اسے بتایا کہ ادھر گاؤں میں ایک بندہ بڑے پراسرار انداز میں کسی دراز قامت گوری چٹی لڑکی کو تلاش کرتا پھر رہا ہے۔ مجھے شک ہے کہ یہ وہی آدمی ہے جو ٹرین میں تمہارا پیچھا کررہا تھا۔ ان حالات میں تمہاری حفاظت کی غرض سے مناسب یہی ہوگا کہ میں تمہیں اپنے بھائی قادو کے ڈیرے پر چند دن کے لیے چھپا دوں۔ بعد میں جب حالات ٹھیک ہوجائیں گے تو میں تمہیں واپس لے آؤں گی۔"

"اور اس نے فوراً تمہاری بات مان لی؟"

"جی بالکل!" وہ بڑے فخر سے بولی۔ "اس کے پاس اور کوئی دوسرا راستہ ہی نہیں تھا۔"

مجھے آنٹی یاسمین کی بے حسی پر بہت غصہ آیا۔ میں نے تلخ لہجے میں دریافت کیا۔ "تو تمہارے خیال میں جب انسان کے پاس کوئی دوسرا راستہ باقی نہیں رہتا تو وہ مجبور ہوجاتا ہے۔"

"تھانے دار صاحب! یہ تو ایک حقیقت ہے۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔

"اس حقیقت کو ذہن میں رکھ کر اپنے حق میں وہ تمام دعائیں کرنا شروع کردو جو تمہیں یاد ہیں۔" میں نے بے حد سفاک لہجے میں کہا۔ "کیونکہ اب تمہارے سامنے بھی بچت کا کوئی دوسرا راستہ باقی نہیں رہا۔ میں تمہیں بہت بری طرح

ایک طویل عرصے کے لیے فٹ کرنے والا ہوں۔“
وہ دہشت زدہ انداز میں مجھے دیکھنے لگی۔

☆☆☆

آئندہ روز میں نے وزیرآباد کا رخ کیا اور وہاں جا کر میں ماہ جبیں کی ماں اور سوتیلے باپ سے ملا اور انہیں حالاتِ حاضرہ سے آگاہ کیا لیکن ان میں سے کسی کو ماہ جبیں کی فکر نہیں تھی۔ اس کی ماں کے نزدیک ماہ جبیں کا دماغی توازن ٹھیک نہیں تھا۔ وہ ہر وقت الٹی سیدھی حرکتیں کرتی رہتی تھی۔ اس کے سوتیلے باپ نے تو یہاں تک کہا کہ ایک رات ماہ جبیں نے اسے قتل کرنے کی بھی کوشش کی تھی۔ الغرض ان دونوں کو ماہ جبیں اور اس کے حالات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

میں وزیرآباد سے واپس گوجرانوالہ آ گیا۔ ماہ جبیں منظر سے غائب ہو چکی تھی اور مجھے ہر حال میں اس کی تلاش تھی۔ میں نے ہمت نہیں ہاری اور پورے ضلع میں اسے کھوجنے کی کوشش میں لگا رہا۔ چند روز کے بعد مجھے پتا چلا کہ جس روز آنٹی یاسمین نے ماہ جبیں کو اپنے گھر سے فرید پور پہنچایا تھا، اسی دن چھچھر والی سے ایک نوجوان غائب ہو گیا تھا۔ وہ بھی تاحال مفقود الخبر تھا۔ مذکورہ نوجوان کا نام زاہد بتایا گیا۔ زاہد کبڈی کا بہت ماہر کھلاڑی تھا۔

اس اطلاع نے میرے رگ وپے میں سنسنی سی دوڑا دی۔ میری نگاہ کے سامنے قادو کی گردن ٹوٹی لاش گھوم کر رہ گئی۔ قادو کی گردن کا منکا جس ماہرانہ انداز میں توڑا گیا تھا وہ کسی پہلوان یا کبڈی کے کسی کھلاڑی کا ہی کام ہو سکتا تھا۔

میں نے چھچھر والی کے چند دانش مند افراد سے معلومات اکٹھا کر کے اپنے آرٹسٹ سے زاہد کا خاکہ تیار کروایا اور زیادہ شدومد کے ساتھ زاہد اور ماہ جبیں کو تلاش کرنے لگا۔ میرے ذہن میں اس کیس کی کڑیاں مکمل ہو چکی تھیں۔ اب مجھے اپنی اس سوچ کی عملی تعبیر چاہیے تھی۔

تین ماہ کے بعد مجھے یہ تعبیر مل گئی۔ محلہ شاہین آباد سے میں ان دونوں کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ انہوں نے شادی کر لی تھی اور میاں بیوی کی حیثیت سے وہاں رہ رہے تھے۔ ماہ جبیں کی کہانی آپ کے علم میں آ چکی ہے۔ زاہد کے بارے میں، میں مختصراً آپ کو بتا دیتا ہوں۔ تھوڑے لکھے کو زیادہ سمجھیں گے تو سمجھ دار کہلائیں گے۔

زاہد کا تعلق چھچھر والی سے تھا اور وہ آنٹی یاسمین کے کردار سے اچھی طرح واقف تھا۔ ماہ جبیں پر اس کی نگاہ پڑی تو وہ دل ہار بیٹھا۔ ماہ جبیں کو اس کے جذبات کی خبر نہیں تھی تاہم زاہد نے ٹھان لی تھی کہ وہ ماہ جبیں کو ہر قیمت پر بچائے گا۔ وہ غیر محسوس انداز میں آنٹی یاسمین کے پیچھے فرید پور والے ڈیرے پر پہنچ گیا اور اسٹور روم میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ اسے رات کا انتظار تھا جب وہ چپکے سے ماہ جبیں کو لے اڑتا۔ پھر جب رات ہوئی اور چودھری رستم کی آمد کے بعد ڈیرے پر قابلِ مذمت گھناؤنے کھیل کا آغاز ہوا تو زاہد فوراً حرکت میں آ گیا۔ اس نے اسٹور روم میں سے آہنی پانا اٹھایا اور قادو کی نظر بچا کر وہ رستم والے بیڈروم میں گھس گیا۔ رستم کو ایسی کسی مداخلت کی توقع نہیں تھی۔ پھر وہ نشے میں چور بھی تھا۔ زاہد نے اسے سوچنے سمجھنے کا موقع نہیں دیا اور اس کے سر کے عقبی حصے میں وزنی رینچ کی ضرب لگا کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔

یہ منظر دیکھ کر ماہ جبیں نے وحشت زدہ انداز میں باہر کی سمت دوڑ لگا دی تھی۔ باہر قادو موجود تھا۔ وہ ماہ جبیں کو پکڑنے کے لیے دوڑا۔ قادو کے پیچھے زاہد نے دوڑ لگا دی۔ رینچ پانے کو وہ رستم کے کمرے ہی میں پھینک آیا تھا۔

وہ تینوں آگے پیچھے دوڑتے ہوئے نہر کے اندر اتر گئے۔ زاہد نے جلد ہی قادو تک رسائی حاصل کر لی اور پلک جھپکتے میں ایک جھٹکے سے اس کی گردن کا منکا توڑ ڈالا۔ پہلے پہل ماہ جبیں یہی سمجھی تھی کہ یہ وہی بندہ ہے جو وزیرآباد سے اس کے تعاقب میں ہے لیکن جب زاہد نے اسے صورتِ حال سے آگاہ کیا تو اس کی جان میں جان آئی۔ زاہد کے ہاتھوں سے دو انسان قتل ہو چکے تھے لہٰذا واپس چھچھر والی جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

انہوں نے باہمی مشاورت سے ایک فیصلہ کر لیا۔

ان تمام تر حالات و واقعات میں ماہ جبیں کا کوئی قصور نہیں تھا۔ اس نے کسی قدم پر ایک معمولی سا جرم بھی نہیں کیا تھا اور گرفتاری کے وقت وہ امید سے بھی تھی۔ زاہد کی اولاد نے اس کے بطن میں اپنی زندگی کا سفر شروع کر دیا تھا۔ وہی زاہد جو ماہ جبیں کا اجنبی محسن اور دو افراد کا قاتل تھا۔ میں نے زاہد کے لیے جس سزا کا انتخاب کیا وہ آپ کو نہیں بتاؤں گا۔

یہ آپ کی ذہانت کے لیے ایک چیلنج ہے۔ اپنی ذہانت کو آزما کر خود کو سسپنس کا ذہین قاری ثابت کریں......

(تحریر: حُسام بٹ)